

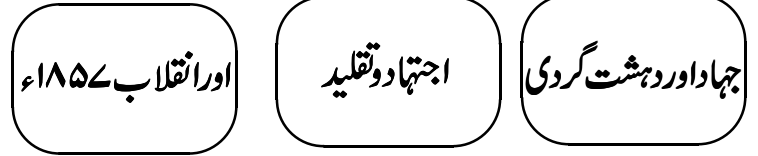
©All rights reserved

Teen Ilmi-o-Fikri interviews

By:Khushtar Noorani

First edition: 2009

Idara-e-Fikre Islami, Delhi
Distributed by: Maktaba Jaam-e-Noor
422 Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-6
Phone: 011-23281418
email: ifikreislami@gmail.com



پر مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں سے تین علمی و فکری انٹرویوز

خوشتار نورانی

ادارہ فکر اسلامی، دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اکتوبر ۲۰۰۲ میں ماہنامہ جام نور دہلی، مذہبی صحافت میں ایک صحت مند انقلاب کی دعوت، مسلکی و مذہبی غیر ضروری رسوم و روایات کے خلاف ایک تحریک اور تعلیم، معیشت اور دعوت و تبلیغ کے حوالے سے نئی نسل کی ذہنی و فکری تشکیل کے اعلامیہ کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ مذکورہ مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ مذہبی صحافت کا جو روایتی ڈھانچہ ہے اسے منہدم کر کے نئے انداز و روایت پر اس کی تعمیر و تشکیل کی جائے، تاکہ وہ کم وقتوں میں اثر انداز ہو کر اپنے ممکنہ ہدف کو پاسکے۔ جس کے لیے ہم نے طباعت اور پیش کش کے ساتھ مشمولات پر خصوصی توجہ دی اور انہیں نئے رنگ و آہنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ جلدی ہی جام نور کے مشمولات میں بے لاگ تبصرے، بے باک تنقید و تجزیے، عصری مسائل پر کھلے مباحث اور مذہبی، ملی، سیاسی اور ادبی شخصیات کے ساتھ انٹرویوز اس کی پہچان بن گئے۔ قیافہ شناسوں نے اس کے تابناک مستقبل اور ہمہ گیر اثرات کا اشارہ دیا تو رجعت پسندوں نے اسے ”مسلکی روایات“ سے نئی نسل کی بغاوت کا بنیادی سبب قرار دیا۔ ان کا یہ خیال غلط بھی نہیں ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں جب پتھر پھینکا جائے تو ارتعاش کا پیدا ہونا فطرت کا لازمہ ہے۔ جام نور کے مشمولات اور اسلوب کی انہی خصوصیات کے حوالے سے برصغیر کے مذہبی اردو حلقے میں اسے شہرت اور منفرد پہچان ملی، کیونکہ ماضی میں نکلنے والے اردو کے مذہبی رسائل ایسے مشمولات سے یکسر خالی تھے۔ ان مشمولات میں خصوصی طور پر انٹرویوز کو کافی مقبولیت ملی جس کی باقاعدہ روایت جام نور نے ڈالی اور اب جبکہ اپنی اشاعت کے یہ سات برس پورے کر چکا ہے، انٹرویوز کا یہ کالم تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ اب تک جام نور نے مختلف حلقوں سے سو سے زائد ارباب علم و فکر سے براہ راست یا بالواسطہ انٹرویوز لیے ہیں

جنہیں دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔

جام نور کے زیادہ تر انٹرویوز ایسے ہیں جو شخصی اور ذاتی نوعیت کے ہیں یا پھر ایسے مسائل پر ہیں جن کا تعلق براہ راست انٹرویو دینے والی شخصیت سے ہو۔ لیکن ان میں تین ایسے بھی انٹرویوز ہیں جو امت مسلمہ کے مشترکہ مسائل ”جہاد اور دہشت گردی“، ”اجتہاد و تقلید“ اور ”انقلاب ۱۸۵۷ء“ کے حوالے سے ہیں۔ مذکورہ تینوں انٹرویوز کو جام نور کے تمام سو سے زائد انٹرویوز میں خصوصی اہمیت حاصل ہے، جس کے دو اسباب ہیں:

ان انٹرویوز کی اہمیت کا پہلا سبب ان کے موضوعات ہیں، جو صدیوں سے امت مسلمہ کے درمیان زیر بحث رہے ہیں اور قرائن بتا رہے ہیں کہ رہتی دنیا تک یہ موضوعات امت کے درمیان تروتازہ رہیں گے اور ان پر مختلف جہتوں سے مباحث ہوتے رہیں گے۔ دوسرا سبب ان کی بین المسلمی حیثیت ہے۔ مذکورہ موضوعات پر انٹرویوز لینے میں اس بات کا خصوصی اہتمام کیا گیا کہ امت مسلمہ کے تمام بنیادی مسائل کے نمائندوں کو ان میں شامل کیا جائے، کیونکہ یہ امت کے مشترکہ مسائل ہیں اور جب تک تمام مسائل کے ارباب نظر کی آراء ان پر حاصل نہیں کی جاتی ان موضوعات کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا۔ اس خیال کے پیش نظر اول الذکر دو موضوعات ”جہاد اور دہشت گردی“ اور ”اجتہاد و تقلید“ پر پندرہ مبسوط اور مفصل سوالات ترتیب دیے گئے اور انہیں جماعت اہل سنت، جماعت اسلامی، اہل حدیث، دیوبندی اور اہل تشیع کے نمائندوں کے پاس ارسال کیے گئے، تاکہ ان کے جوابات کی روشنی میں کوئی متفقہ نتیجہ برآمد ہو سکے اور متلاشیان حق کو ان مسائل میں اسلام کے صحیح موقف تک رسائی ہو۔ جب کہ مؤخر الذکر تیسرے موضوع ”انقلاب ۱۸۵۷ء“ پر دو ماہرین سے (جن میں ایک کا تعلق مذہبی اور دوسرے کا عصری دانش گاہ سے ہے) جوابات حاصل کیے گئے، اس یقین کے ساتھ کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے قائدین کے حوالے سے تاریخ کے متعصبانہ رویے کی ضرور اصلاح ہوگی۔ اس سلسلے میں ہماری کوششیں کتنی بار آور ہوئی ہیں، یہ انٹرویوز کا مطالعہ بتائے گا۔

خوشتر نورانی یکم نومبر ۲۰۰۹ء

11/9 کے حادثے کے بعد پوری دنیا میں اسلامی قوانین و نظریات اور مسلمانوں کے مذہبی، قومی اور سیاسی رجحانات عالمی بحث کا موضوع بن گئے۔ یہ بحثیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے دو طرح کی ہیں۔ پہلی نوعیت ایسی بحثوں کی ہے جس میں میڈیائی پروپیگنڈے سے قطع نظر خالص علمی اور تاریخی پیرائے میں یہ معلوم کرنے کی کوشش ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک ”جہاد“ اور ”دہشت گردی“ کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اور کیا مذکورہ دونوں الفاظ فکری اور عملی طور پر اپنے اندر ایک ہی معنی رکھتے ہیں یا معنوی حیثیت سے دونوں ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ اگر مختلف ہیں تو پھر وہ کیا اسباب رونما ہوئے کہ چند مسلم تنظیموں نے جہاد کے نام پر دہشت گردی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ جبکہ دوسری نوعیت ایسی بحثوں کی ہے جو مذہبی مخالفت، میڈیائی پروپیگنڈے اور عوامی رجحانات کے زیر اثر ہیں، جس میں اسلام اور مسلمانوں کو یک طرفہ مجرم قرار دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ افسوس ہے کہ ان مباحث کو ایک صدی گزر جانے کے باوجود آج تک اجتماعی طور پر کوئی متفقہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ اس کی بنیادی وجہ مذہبی تعصب بھی ہے، عوامی ناواقفیت بھی اور سیاسی مصالح بھی، جو جہاد اور دہشت گردی کے تعلق سے اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ کو صاف نہیں ہونے دیتے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سچائی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی صاف ستھری حیثیت کو مسخ کرنے میں جہاں مذہبی تعصب، عوامی ناواقفیت اور سیاسی مصالح کی کار فرمائی ہے وہیں بلکہ ان سے زیادہ اندرون خانہ خود مسلمانوں کی ان مذہبی و سیاسی تنظیموں اور تحریکوں کا ہاتھ ہے جن کے متشددانہ مسلکی نظریات نے ”جہاد“ اور ”دہشت گردی“ کے درمیان ایک بڑے فرق کو ختم کر ڈالا ہے اور اپنے افراد کو یہ عرفان بخشا ہے کہ اس فرق کو مٹا کر ہی بہشت تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے افغانستان، پاکستان، ہندوستان اور یورپ و امریکہ کے

جہاد اور دہشت گردی

مختلف خطوں میں بے قصور لوگوں کو اپنے نام نہاد جہاد کا نشانہ بنایا، جمہوریت کا بایکٹ کیا، جمہوری الیکشن میں شرکت پر حرمت کا فتویٰ جاری کیا اور مسلم عورتوں اور بچوں کی تعلیم پر پابندی عائد کر کے ان کو جہالت کی تاریکی میں رکھنے پر اصرار کیا۔ مفروضہ شرک کے خاتمے اور بہشت کے حصول کے لیے مذکورہ احمقانہ عمل اب بھی دنیا کے مختلف علاقوں میں جاری ہے۔ اسلام اور جہاد کے نام پر ان غیر اسلامی اقدامات کے رد عمل میں عالمی سطح پر بے چینی، پروپیگنڈے، الزامات اور بحثوں نے اسلام اور مسلمانوں کو بری طرح داغدار کیا، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ مذکورہ اقدامات اور ان پر اقوام عالم کے رد عمل نے دنیا کے مسلمانوں کو اجتماعی طور پر خواب غفلت سے بیدار ہونے پر مجبور کر دیا اور ان کے ایک بڑے طبقے کے نام نہاد جہاد اور دہشت گردی کے خلاف علمی، فکری اور عوامی احتجاج اور واضح نقطہ نظر نے دنیا کے ایک بڑے حصے کو یہ باور کرایا کہ امت مسلمہ نظریاتی طور پر دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ امت کا پہلا طبقہ صوفی اسلام سے تعلق رکھتا ہے جو داعیانہ اوصاف کا حامل ہے اور محبت، رواداری اور انسانیت کے ذریعے اپنی منزل تک پہنچنا چاہتا ہے، دراصل یہی طبقہ اپنی عددی اکثریت کے ساتھ موروثی اور تاریخی طور پر حقیقی اسلام کا نمائندہ بھی ہے۔ جبکہ دوسرا طبقہ وہابی اسلام کی نمائندگی کرتا ہے، جو اپنے ہدف کے حصول کے لیے تشدد، سختی، انتشار، بے اعتدالی اور جنگ و جدال پر اصرار کرتا ہے۔ امت کا یہ طبقہ اٹھارویں صدی عیسوی کی پیداوار ہے جو عددی طور پر بہت کم ہونے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کو مطعون اور متہم کرنے کا براہ راست یا بالواسطہ ذمہ دار ہے۔ یہ محض الزام نہیں، کیونکہ تلاش و جستجو کے بعد اس حقیقت کا سراغ لگانا مشکل نہیں رہ جاتا کہ ایسی تمام مسلم تنظیمیں اور تحریکیں جو جہاد کے نام پر دہشت گردانہ کارروائیوں میں مصروف ہیں ان کا تعلق امت کے اسی دوسری طبقے سے ہے۔ اس سچائی کو مزید واضح گف کرنے کی ضرورت ہے تاکہ داخلی سطح پر امت کے بھولے بھالے افراد ان کے اس مذہبی و سیاسی تشدد میں فکری و عملی طور پر معاون نہ بن سکیں

اور بیرونی سطح پر دنیا کو یہ پیغام دیا جاسکے کہ ”ہر مسلمان دہشت گرد نہیں“۔ واضح رہے کہ امت کے اس طبقے کا کوئی وکیل صفائی اگر یہ کہتا ہے کہ عالمی امن اور جمہوریت کے تحفظ کے نام پر مسلم ممالک پر امریکی، برطانوی اور اسرائیلی فوج کشی اور ان کا غاصبانہ تسلط بھی تو کھلی دہشت گردی ہے؟ ایسا کہنے والا یقیناً حق بجانب ہوگا، مگر یہ ایک الزامی جواب تو ہو سکتا ہے، جہاد کے نام پر دہشت گردانہ کارروائیوں کو جواز نہیں فراہم کر سکتا۔ اسلام امن و سلامتی اور محبت و رواداری کا داعی ہے اور ضرورتاً استثنائی طور پر کچھ شرطوں کے ساتھ ”دفاعی جنگ“ کی اجازت دیتا ہے۔ جو جہاد کے وسیع تر مفہوم (نفسانیت، ظلم اور برائیوں کے خاتمے) کا ایک حصہ ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ دفاعی جنگ جابر حکمرانوں اور ان کی افواج سے لڑی جائے گی، مظلوم رعایا سے نہیں۔

جہاد اور دہشت گردی کے مذکورہ مفہوم کو امت کے بڑے طبقے تک پہنچانے کے لیے مئی ۲۰۰۴ء میں اردو کے مذہبی رسائل و جرائد کی دنیا میں پہلی بار ماہنامہ ”جام نور“ نے ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ”جہاد نمبر“ نکالا تھا جس کی پوری برصغیر میں پزیرائی ہوئی۔ اس خصوصی شمارے میں برصغیر کے تمام مکاتب فکر کے نمائندوں سے ایک تفصیلی اور خصوصی انٹرویو کا بھی اہتمام کیا گیا تھا تاکہ ان کے جوابات کی روشنی میں امت مسلمہ پر یہ واضح ہو سکے کہ وہ امت کے دو طبقوں میں سے کس طبقے کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اُس طبقے کی جو امن اور محبت کے ذریعے اپنے مسائل کا تذکرہ اور اسلام کی توسیع چاہتا ہے یا اُس طبقے کی جو جنگ و جدال اور تشدد کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کو پوری دنیا کے سامنے ذلیل و رسوا کر رہا ہے۔ کیونکہ عصر حاضر کے اس حساس اور نازک مسئلے میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اگر داخلی طور پر باشعور اور بیدار ہو جائے تو پھر بیرونی سطح پر اس مسئلے کو ختم کرنا کوئی مشکل نہیں رہ جاتا۔ اس انٹرویو میں ۱۳۰ قبیح سوالات پر جن علماء نے اپنے اپنے مسلک کی نمائندگی کی ہے وہ ذمہ دار بھی ہیں اور معروف بھی۔ ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

(۱) مولانا یسین اختر مصباحی، بانی و سربراہ دارالقلم دہلی

(۲) مولانا وحید الدین خان، صدر اسلامی مرکز دہلی

(۳) مولانا شفیع مونس، نائب امیر جماعت اسلامی ہند دہلی

(۴) مولانا عبد الوہاب خلیجی، سابق ناظم عمومی جمعیت اہل حدیث دہلی

(۵) مولانا نظر شاہ کشمیری، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

(۶) مولانا کلب جواد نقوی، رہنما جماعت اہل تشیع لکھنؤ

سوال:- (۱) قرآن و احادیث کی روشنی میں نظریہ جہاد کی وضاحت فرمائیں؟

مولانا یسین اختر مصباحی:- قرآن و حدیث میں صراحت و وضاحت کے ساتھ جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے، حق کا بول بالا کرنے، باطل کی سرکوبی کرنے، ظلم کے خلاف صف آرا ہونے اور انسانیت کے تحفظ کے لیے مسلمانوں پر جہاد کو فرض کیا گیا ہے اور اس میں کسی بھی طرح حصہ لینے والے مجاہدین کے لیے اجر و ثواب کا اللہ رب العزت نے وعدہ فرمایا ہے۔ یہ جہاد اسی وقت کیا جائے گا جب اس کی شرطیں پائی جائیں گی اور اس کے اصول و حدود اور آداب کا پاس و لحاظ اور ان کی پابندی ہر مجاہد کے لیے ضروری ہے۔ جس کا نمونہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام مختلف جہادوں کے دوران پیش کر چکے ہیں۔ ہر جہاد کے اندر اس عملی نمونہ کی پابندی لازمی ہے۔

مولانا وحید الدین خاں:- قرآن اور حدیث میں ”جہاد“ کا لفظ اصلاً پر امن جدوجہد کے لیے آیا ہے۔ جہاں تک مسلح جنگ کا تعلق ہے، اس کے لیے قرآن اور حدیث میں قتال کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جہاد کا لفظ اگر کہیں جنگ کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو وہ اس لفظ کا ایک توسیعی مفہوم ہے، نہ کہ اس کا اصل مفہوم۔

مولانا شفیع مونس:- جہاد کے لغوی معنی ہیں کسی کام یا مقصد کے حصول کے لیے انتہائی جدوجہد کرنا، جہد نیکی کی راہ میں بھی ہو سکتی ہے اور بدی کی راہ میں بھی۔ اس لیے قرآن مجید نے مزید حد بندی کے لیے فی سبیل اللہ کے الفاظ استعمال کیے تاکہ نفس کی کسی خواہش اور کوئی ذاتی غرض یا قومی مفاد یا عداوت کا جذبہ اس میں داخل نہ ہو سکے اور وہی کوشش مراد لی جائے جو صرف اللہ کے لیے ہو اور انہیں مقاصد میں صرف کی جائے جنہیں اللہ نے پسند فرمایا۔ انسان کے تمدنی بنیادی حقوق میں سب سے پہلا حق اس کے زندہ رہنے کا حق ہے اور سب سے پہلا فرض دوسروں کو زندہ رہنے دینے کا فرض ہے، جس قانون اور مذہب میں اسے تسلیم نہ کیا گیا ہو اس کے تحت رہ کر پر امن زندگی بسر نہیں کی جاسکتی اور اسے

دوسروں کی زمین زور زبردستی سے ہتھیا کر خود کو اس جگہ آباد کرنا اور اس کے اصلی باشندوں یا مالکان کو نکال باہر کرنا بھی شامل ہے۔

جہاد ان لوگوں کے خلاف بھی کیا جانا مشروع ہے جو دوسروں کی آبادیوں اور شہروں پر مظاہرے کر کے یا زبردستی قبضے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے خلاف بھی جہاد مشروع ہے جو افراد و اقوام کے درمیان عہد شکنی اور بددیانتی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کو فتنہ و فساد اور ضرر رساں اعمال سے چھٹکارا دلانے کی جدوجہد بھی جہاد میں شامل ہے۔ ان لوگوں کے خلاف بھی جہاد مشروع ہے جو لوگوں کے مال و جائیداد کو سلب کر لیں یا جہاں مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات کی اشاعت و بیداری پیدا کرنے کی آزادی نہ ہو۔ ارشاد الہی ہے ”لَا يَنْهَاكُمْ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوا فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (الممتحنة: ۸) ترجمہ: جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی اور تمہیں جلاوطن نہیں کیا، ان کے ساتھ سلوک و احسان کرنے اور منصفانہ بھلے برتاؤ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں روکتا، بلکہ اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

سوال: (۲) مختلف ملکوں میں جو تنظیمیں جہاد کے نام پر جدوجہد کر رہی ہیں ان سے جزوی یا کلی طور پر آپ کہاں تک متفق ہیں؟

مولانا یسین اختر مصباحی: - دنیا کے اندر سرگرم مسلم تنظیموں کے ہر اقدام کو نہ جائز ٹھہرایا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی حمایت کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح مسلم تنظیموں کے ہر اقدام کو ناجائز ٹھہرانا اور اس کی مخالفت کرتے رہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اگر اسلام کے نام پر کوئی کام کیا جا رہا ہے تو اسلامی نقطہ نظر سے اس کا جائزہ لیا جائے گا اور اس کے بعد ہی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ صحیح ہے یا غلط ہے۔ اسلامی دائرہ کے اندر رہتے ہوئے مسلم تنظیموں کی جو بھی سرگرمیاں ہیں وہ جہاد کے وسیع معنی و مفہوم کے دائرہ میں شامل ہیں۔ البتہ حرب و ضرب اور قتل و خوں ریزی کے واقعات و حادثات کو آنکھ بند کر کے اصطلاحی جہاد بمعنی قتال نہیں کہا جاسکتا۔ مسلم ممالک یا مغربی ممالک کے اندر سرگرم مسلم

فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ہے انسان کی ناگزیر ضرورت کی بات، رہا اس کا اخلاقی پہلو تو کسی انسان ”ابن آدم، اپنے بھائی“ کو ناحق قتل کر دینا انتہا درجہ کی سنگدلی اور انسانیت دشمنی ہے، چنانچہ ایک مذہب کے لیے لازم ہے کہ اپنے پیروؤں کے ذمہ اس کی صحیح قدر و اہمیت پیدا کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(ترجمہ) ”وہ اس جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے بغیر حق کے ہلاک نہیں کرتے اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ کیے کی سزا پائے گا۔“ (الفرقان: ۶۸)

اور خود رسول ﷺ نے بھی انسان کی جان اور اس کے خون کی حرمت جگہ جگہ بیان فرمائی۔ مثلاً:

(ترجمہ) ”بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے اور قتل نفس اور والدین کی نافرمانی اور جھوٹ بولنا۔“

مولانا عبدالوہاب خلیفی: - جہاد قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک واضح عمل اور اجتماعی فریضہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کو اسلام کی سب سے اونچی چوٹی قرار دیا ہے۔ جہاد ایک مشروع عمل ہے۔ شریعت اسلامی میں جہاد کی ترغیب دلائی گئی ہے جب کہ دہشت گردی اور فتنہ و فساد کو اسلام نے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی ہدایت دی ہے۔ ارشاد باری ہے ”وَلَا تَفْسُدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا“ اسلام نے جہاد کو حق کی نصرت، ظلم و زیادتی سے دفاع، امن و سلامتی کی پائیداری اور عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے مشروع قرار دیا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی اس رحمت و شفقت سے اہل جہاں بہرہ ور ہو سکیں، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے امام الانبیاء محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا، تاکہ وہ لوگوں کو جہالت کے تنگ و تاریک راستے سے نکال کر اسلام کی روشن شاہراہ پر گامزن کر سکیں اور اس کے ذریعہ دہشت گردی اپنی تمام شکلوں میں ختم ہو سکے۔

جہاد کی مشروعیت اس لیے بھی ہے کہ اس کے ذریعہ عوام کو ان لوگوں سے بھی تحفظ مل سکے جو اپنے توسیع پسند عزائم کے ذریعہ دوسروں کی زمین اور وطن پر ناجائز قابض ہونا چاہتے ہیں۔ ان کے مقاصد لوگوں کے مال و متاع اور قومی املاک کو غصب کرنا اور

جنگ میں نہیں ہے۔

مولانا شفیع مونس:۔ جہادی جدوجہد کے تحت صرف انہیں شہریوں کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے جو عملاً جنگ میں حصہ لیتے ہوں یا عقلاً و عرفاً حصہ لینے کی قدرت رکھتے ہیں، یعنی جوان مرد، جن پر اہل قتال کی اصطلاح صادق آتی ہے اور ان کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی جاسکتی جو اہل قتال نہ ہو، مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، زخمی، اندھے، مقطوع الاعضاء، مجنون، سیاح، خانقاہ نشین زاهد، معبدوں اور مندروں کے مجاور اور ایسے ہی دوسرے بے ضرر لوگ۔

مولانا عبدالوہاب خلیجی:۔ جہاد کے نام پر بے قصور، بے گناہ اور معصوم جانوں کا زیاں غیر اسلامی عمل ہے۔ اسلام میدان جنگ میں بھی اس امر کی شدت کے ساتھ رعایت رکھتا ہے، چہ جائیکہ عام شہریوں کو نشانہ بنایا جائے۔

سوال:۔ (۴) کیا جہاد کے نام پر اسلام خود کش حملے کی اجازت دیتا ہے؟

مولانا یسین اختر مصباحی:۔ اسلام نے خود کشی کو ہر حال میں ناجائز قرار دیا ہے۔ یہ بزدلی بھی ہے اور جہنم میں لے جانے کا سبب بھی ہے۔ اسلام یا جہاد یا کسی بھی نام یا کسی بھی طریقہ سے خود کشی کرنا ناجائز نہیں ہے۔ اگر حقیقی جہاد ہو رہا ہو اور دشمن فوج پر کوئی مسلمان خود کش حملہ کرے جو اس وقت کہیں کہیں رائج ہے تو اس میں صرف خود کشی کا وبال ہے اور اگر عام حالات میں ایسا خود کش حملہ ہے تو یہ دوہرا جرم ہے کہ اس کے اندر خود کشی بھی ہے اور دوسروں کا خون ناحق بھی ہے۔

مولانا وحید الدین خاں:۔ خود کشی یا خود کش حملہ کرنا یقینی طور پر حرام ہے۔ جہاد کا نام دینے سے کوئی حرام کبھی حلال نہیں ہو سکتا۔ موجودہ زمانہ کے نام نہاد مجاہدین مختلف مقامات پر جو خود کش بمباری (Suicide bombing) کر رہے ہیں وہ بلاشبہ حرام ہے۔ خود کشی کسی بھی عذر کی بنا پر اسلام میں جائز نہیں۔ مزید یہ کہ یہ خود کش بمباری عام طور پر غیر مقاتلین (non-combatants) کے اوپر کی جاتی ہے، کیونکہ وہ سافٹ ٹارگٹ (Soft target) سمجھے جاتے ہیں۔ یہ دوسرا پہلا اس حرمت کو اور بھی زیادہ سنگین بنادیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اسلام کی جو بدنامی ہو رہی ہے وہ تمام نقصانات میں سب سے زیادہ

تنظیمیں اس وقت اگر دنیا کے کسی حصہ میں اپنی مخالف طاقت کے سامنے سینہ سپر ہیں یا اس کے مفادات کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی حملہ کریں تو اسے اپنے تحفظ و دفاع یا انتقام کی پر جوش و استقلال انگیز کارروائی کہا جاسکتا ہے، مگر اسلامی جہاد کا نام اسے نہیں دیا جاسکتا۔

مولانا وحید الدین خاں:۔ غیر حکومتی تنظیموں کی طرف سے جہاد (بمعنی قتال) کا عمل جو آج کل مختلف مسلم گروہوں کی طرف سے جاری ہے وہ بلاشبہ غیر اسلامی ہے۔ یہ سب جہاد کے نام پر فساد کا عمل ہے۔ کیوں کہ جہاد (بمعنی قتال) سر تا سر حکومت کی ذمہ داری ہے۔ غیر حکومتی تنظیموں کے لیے پرامن دعوت ہے نہ کہ مسلح جہاد۔

مولانا شفیع مونس:۔ مختلف ملکوں میں جو تنظیمیں دعوت حق اور فتنہ و فساد کے خلاف تعلیم و تلقین سے کام لے رہی ہوں ان کی جدوجہد سے یقیناً اتفاق کیا جائے گا۔ رہیں وہ تنظیمیں جنہوں نے مسلح جدوجہد کی راہ اختیار کی ہو تو ان کے سلسلہ میں الگ الگ صحیح واقفیت نہایت ضروری ہے تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ اسلامی تعلیمات نے جو شرائط و آداب لازم قرار دیے ہیں ان کا کہاں تک پاس و لحاظ کیا جا رہا ہے۔

مولانا عبدالوہاب خلیجی:۔ پوری دنیا میں ظلم و جبر کے خلاف اٹھائی جانے والی آواز ہر کلمہ گو کے دل کی آواز ہے۔ اعلیٰ کلمۃ اللہ اور دعوت اسلامی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کی تمام مساعی جمیلہ سے ہر انصاف پسند کو متفق ہونا چاہیے۔

سوال:۔ (۳) جہادی جدوجہد کے تحت عام شہریوں کو جو نشانہ بنایا جا رہا ہے، کیا یہ عمل اسلامی نظریہ جہاد سے ہم آہنگ ہے؟

مولانا یسین اختر مصباحی:۔ غیر متعلق شہری، عام آدمی، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، عبادت گاہوں اور عوامی اداروں کو ہلاک و برباد کرنے کی اجازت اسلامی جہاد کے اندر بھی نہیں ہے تو عام جنگوں و حملوں میں ایسی حرکتیں کس طرح گوارہ کی جاسکتی ہیں؟

مولانا وحید الدین خاں:۔ عام شہریوں کو تشدد کا نشانہ بنانا کسی حال میں جائز نہیں، حتیٰ کہ کسی مسلم حکومت کے تحت ہونے والے جائز جہاد میں بھی نہیں۔ جائز جہاد میں بھی صرف مقاتل پر وار کیا جاسکتا ہے، غیر مقاتل پر وار کرنے کی گنجائش اسلام کے اصول

بڑا نقصان ہے۔

مولانا شفیع مونس:- جہاد فی سبیل اللہ کے تقاضوں کی ادائیگی، شرائط و آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے تو یقیناً نہایت اعلیٰ درجہ کا نیک کام ہے اور اس میں جان کی قربانی مجاہد کو اللہ کی راہ میں شہادت کا اور آخرت میں جنت کے بلند مقام کا مستحق قرار دیتی ہے۔ جو حملے خود کشی کے ارادے اور اہتمام سے کیے جائیں اسلام ان کی اجازت نہیں دیتا۔

مولانا عبدالوہاب خلمی:- اسلام نے خود کشی کے عمل کو حرام قرار دیا ہے۔ اجتماعی مصالح اور امت کے تحفظ کے پیش نظر اس کی گنجائش موجود ہے۔ ظلم و ستم کی شدت و تشدد کو دیکھتے ہوئے اس کی رعایت کی جائے گی۔ علامہ یوسف القرضاوی نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ ویسے یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے جس میں فقہائے امت کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال:- (۵) استعماری قوت سے اپنی آزادی یا اپنی تہذیب و ثقافت کے تحفظ یا مسلم ممالک کے قدرتی وسائل کو استحصال سے بچانے کے لیے یا باطل قوتوں کی نا انصافیوں اور ظلم و تغلب کے خلاف جو تنظیمیں جہاد کے نام پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہیں ان کے نتائج اب تک کتنے مثبت اور کتنے منفی ہوئے؟

مولانا یلین اختر مصباحی:- اسلام و مسلمین اور عالم اسلام کے مفاد کے خلاف استعماری قوتیں جو کچھ کر رہی ہیں جس طرح مسلم ممالک پر غلبہ و تسلط اور ان کے معدنی ذخائر و قدرتی وسائل کا استحصال کر رہی ہیں ان سب کے سازشی و سامراجی عزائم کو ناکام بنانے کی ہر جائز و مفید کوشش و مزاحمت ضرور ہونی چاہیے۔ البتہ حکمت عملی اور مصلحت وقت کے پیش نظر جہاد، جہادی اور مجاہد جیسی اصطلاحات کے غیر ضروری استعمال سے اجتناب و احتراز کرنا ہی دانش مندی و دور اندیشی ہے۔

مسلم تنظیموں کو اپنی سرگرمیاں دفاع و مزاحمت کے نام سے اسلامی اصول کی پابندی اور بین الاقوامی ضابطوں کا لحاظ رکھتے ہوئے جاری رکھنا چاہیے۔ اپنی مسلم حکومتوں کے داخلی تصادم اور دیگر ممالک کے امور و معاملات میں مداخلت سے انہیں پرہیز کرنا چاہیے۔ ہر اقدام و حملہ کو جہاد کا نام دینے سے اسلام دشمن عناصر جہاد کا نام بدنام کرتے ہیں

اور مسلمانوں کو دہشت گرد و جنگجو قوم کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض مسلم ممالک کو طرح طرح کی مشکلات اور پریشانیاں اس کی وجہ سے جھیلی پڑتی ہیں۔ قرآن اور اسلام پر بیجا حملوں کا ایک سلسلہ مخالفین کی طرف سے شروع ہو جاتا ہے، یہ اس کا منفی پہلو ہے اور مثبت پہلو یہ ہے کہ اس طرح کی سرگرمیوں کے نتیجے میں بہت سارے استعماریت پسند ممالک اپنے ملکوں کی سرحدوں کے اندر سمٹ کر رہ گئے ہیں، ان کے لیے اب آسان نہیں رہ گیا ہے کہ پہلے کی طرح جہاں چاہیں دندناتے پھرتے رہیں۔ ہاں! صرف امریکہ ایک ایسی سپر طاقت باقی رہ گئی ہے جس کے توسیع پسند عزائم کو لگام نہیں دی جاسکتی ہے، لیکن یہ بھی ہر جگہ کشمکش اور ذہنی اذیت میں مبتلا ہے اور امریکی جہاں بھی قابض و متصرف ہیں ان کے دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہوتی جا رہی ہے۔

مولانا وحید الدین خاں:- پانچویں سوال میں جن مقاصد کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کسی بھی مقصد کے لیے غیر حکومت تنظیموں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ مفروضہ دشمن کے خلاف مسلح جہاد چھیڑ دیں۔ ان مقاصد کے نام پر موجودہ زمانہ میں جو مسلح جہاد کیا گیا ہے وہ ایک غیر اسلامی فعل تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کی نصرت حاصل نہ کر سکا اور اس بنا پر اپنے مقصد کے حصول میں مکمل طور پر ناکام رہا۔

مولانا شفیع مونس:- استعماری قوت سے آزادی کا تو عوام کو از روئے اسلام بھی حق حاصل ہے اور موجودہ بین الاقوامی قوانین کی رو سے بھی، اس لیے جو جماعتیں اور قومیں اس کے لیے پرامن جدوجہد کر رہی ہوں ان کو اس کا حق بھی حاصل ہے اور کسی نہ کسی درجے میں پیش رفت بھی ہو رہی ہے۔ البتہ جہاں کہیں مسلح جدوجہد ہوتی ہو اس کے سلسلے میں جواز کا بھی سوال اٹھتا ہے اور یہ بھی مشکل ہے کہ صحیح اور مکمل معلومات کے بغیر اثرات و نتائج کے متعلق کچھ متعین طور پر کہا جاسکے۔

مولانا عبدالوہاب خلمی:- استقلال و آزادی کے نام پر جاری سرگرمیاں بعض مقامات پر مثبت نتائج کی حامل رہیں، بعض مقامات پر امت کے خسارہ کا سبب بنیں، جس کی تفصیلات سے سبھی آگاہ ہیں۔ جن مقامات پر خلوص و للہیت اور جذبہ صادق کے ساتھ

اصول پر مبنی ہیں، مگر موجودہ دنیا میں جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ دو طرفہ ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے جذبات کے ساتھ خارجی حالات کا بے لاگ جائزہ لیں۔ خارجی حالات کی رعایت کرنے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ہماری کوشش کامیاب ہو سکے۔ موجودہ قسم کی جہادی سرگرمیوں میں یہ خارجی رعایت مفقود ہے۔ جب تک یہ صورت حال باقی رہے گی، ہماری کوششیں ناکامی کے سوا اور انجام تک نہیں پہنچ سکتیں۔

جہاد دراصل ایک پرامن جدوجہد ہے جو گہری منصوبہ بندی کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ جہاد کی عملی طور پر دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک ہے کھوئے ہوئے پر جہاد اور دوسرا ہے ملے ہوئے پر جہاد۔ میرے مطالعہ کے مطابق موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کے درمیان جہاد کے نام پر بے شمار ہنگامے جاری رہے، مگر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جہاد کے نام پر کی جانے والی یہ تمام سرگرمیاں کھوئے ہوئے پر جہاد کے ہم معنی تھیں نہ کہ ملے ہوئے پر جہاد کے ہم معنی۔

امیر کابل کے تعاون سے شاہ ولی اللہ کا جہاد، سلطان ٹیپو کا جہاد، شہیدین کا جہاد، علمائے دیوبند کا جہاد، علی برادران کا احیاء خلافت کے نام پر جہاد، قیام پاکستان کے لیے جہاد، آرائیس ایس کے خلاف جہاد، بابر مسجد کے لیے جہاد، وغیرہ وغیرہ سب کے سب کھوئے ہوئے پر جہاد کی صورتیں ہیں۔ اس لیے یہ تمام جہادی قربانیاں حبط اعمال کا شکار ہو گئیں۔

یہی معاملہ دیگر مقامات پر کیے جانے والے جہاد کا ہے۔ مثلاً فلسطین کا جہاد، بوسنیا کا جہاد، چیچنیا کا جہاد، فلپائن کا جہاد، اراکان کا جہاد، کشمیر کا جہاد وغیرہ، سب کے سب کھوئے ہوئے پر جہاد کے ہم معنی تھا۔ اس لیے امت کو ان کے ذریعہ تباہی کے سوا کچھ اور حاصل نہیں ہوا۔ میرے علم کے مطابق اس پوری مدت میں پوری مسلم دنیا میں جہاد کے نام پر کیا جانے والا کوئی بھی عمل ایسا نہیں جس کو ملے ہوئے پر جہاد کا نام دیا جاسکے۔

اس معاملہ میں اب اصل ضرورت پورے معاملہ پر نظر ثانی (Reassessment) کی ہے نہ یہ کہ اپنی ناکامی کو دوسروں کے خانہ میں ڈال کر مفروضہ دشمنوں کے خلاف شکایت اور احتجاج کی مہم چلائی جائے۔ زندگی کی ایک سنگین حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان کو اپنی غلطی کی قیمت خود بھگتنی پڑتی ہے، ایک غلطی کی قیمت کوئی دوسرا شخص کبھی بھگتنے والا نہیں۔

اسلامی شریعت کی روشنی میں جدوجہد کی گئیں وہاں کامیابی ان کے ہم قدم ہوئی اور جہاں مفادات، ذاتی مصالح اور کشور کشائی کے پیش نظر اقدامات کئے گئے وہ امت کے لیے مضر ثابت ہوئے۔

سوال:- (۶) جن مقاصد کے حصول و تحفظ کے لیے جہادی تنظیموں نے جو طریقے اپنائے، کیا ان مقاصد کے حصول کے لیے یہی ایک راہ ہے؟ یا دوسرے طریقے بھی اپنائے جاسکتے ہیں؟

مولانا یسین اختر مصباحی:- براہ راست ٹکراؤ سے بچتے ہوئے دوسرے طریقے اپنا کر اپنے مقاصد و اہداف تک پہنچنا چاہیے۔ مذاکرہ و ملاقات، صحافت و سفارت و سیاست وغیرہ کے بہت سے راستے کھلے ہوئے ہیں انہیں اپنانے کی ضرورت ہے، لیکن یہ تنظیمیں شاید کہیں کہیں اور کبھی کبھی ”تنگ آمد جنگ آمد“ کے صدیوں پرانے نسخہ پر عمل پیرا ہو جاتی ہیں جس سے وہ خود مبتلائے مصیبت ہوتی ہیں اور دوسرے مسلمانوں کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دنیا کی بہت ساری غیر مسلم تنظیمیں سازش اور تشدد کے بہت سارے طریقے اپناتی ہیں، لیکن یہ اس دور کی بد نصیبی ہے کہ نشانہ پر صرف مسلم تنظیمیں رہتی ہیں۔ ان کے ہر عمل کو دہشت گردی بلکہ اسلامی دہشت گردی کا نام دیا جاتا ہے اور جب ایسا ہی کوئی کام فلسطین یا بوسنیا یا آئرلینڈ یا سری لنکا یا گجرات و آسام وغیرہ میں ہوتا ہے تو ان کو مذہب کے ساتھ جوڑ کر انہیں یہودی یا مسیحی یا ہندو دہشت گردی کا نام نہیں دیا جاتا ہے۔ اس طرز فکر و عمل کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟

مولانا وحید الدین خاں:- چھٹے سوال میں جن مقاصد کا ذکر ہے ان کے حصول کی تدبیر صرف ایک ہے اور وہ پرامن جدوجہد ہے۔ تشدد پر مبنی جدوجہد کے ذریعہ ان مقاصد کا حصول سرے سے ممکن ہی نہیں، جیسا کہ عملاً پیش آیا۔

ان مقاصد کے لیے موجودہ زمانہ میں جو کوشش کی گئی ہیں وہ زیادہ تر جہاد یا ٹکراؤ کے

امراء و حکام کے مشورہ سے جب اعلان جہاد کرے تو وہ نافذ العمل ہوگا۔ اسلام اور مسلمانوں کے وجود اور عزت و قار پر جب کسی غیر مسلم طاقت کی طرف سے حملہ ہو، کسی مسلم ملک کے اندر کوئی بیرونی طاقت گھس آئے تو ایسے ناگزیر حالات میں بشرط قوت و تیاری جہاد کیا جائے گا اور یہ اس دور اور اس ملک کے ارباب حل و عقد کی صواب دید اور ان کے فیصلے پر منحصر ہے۔

مولانا وحید الدین خاں:- اسلام میں جہاد (بمعنی قتال) کی صرف ایک صورت ہے، اور وہ برائے دفاع ہے۔ دفاع کے سوا کسی بھی دوسرے مقصد کے لیے جنگ چھیڑنا اسلام میں جائز نہیں، اور دفاع کی یہ جنگ اعلان کی لازمی شرط کے ساتھ صرف ایک قائم شدہ مسلم حکومت ہی کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں گوریل جنگ، پر کسی جنگ، جارحانہ جنگ، بلا اعلان جنگ سب ناجائز ہیں۔

مولانا شفیع مونس:- حکم جہاد کا نفاذ کسی امام یا سربراہ حکومت کو کرنا چاہیے، رہے افراد تو وہ خود اس کے مجاز نہیں ہیں کہ اپنے طور پر کوئی فیصلہ کر کے قدم بڑھا سکیں، کیونکہ ظاہر ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس سے پیش نظر مقصد کے حصول کی توقع نہیں کی جاسکتی بلکہ اس طرح کے اقدامات الٹے مزید فتنہ و فساد اور کشت و خون ریزی کے باعث ہوں گے۔ رہا امام یا قائد وغیرہ کے انتخاب کا سوال تو اس کے لیے شورائی طریقہ کا اختیار کرنا چاہیے یعنی ان کا نصب ہو یا عزل، جمہور کی آزاد مرضی سے ہونا چاہیے۔

مولانا عبدالوہاب خلیجی:- جہاد کے نفاذ اور شرعی حدود، قصاص، حد سرقہ، زنا وغیرہ کے لیے شرعی امام کا ہونا ضروری ہے، کسی فرد یا جماعت کو اس کا حق حاصل نہیں، جہاں پر مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں بھی وہ ایک معاہدہ اور نظام کے پابند ہیں، اپنے امن و تحفظ، اسلامی شعار کی بجا آوری اور شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ اجتماعی نظام قائم کرنے کے لیے جو مناسب طریقے ہوں اسے اختیار کیا جانا چاہیے۔

سوال:- (۸) جہاد کو غلط طور پر پیش کر کے مسلمانوں کے خلاف عالمی پیمانے پر جو سازشیں رچی جا رہی ہیں اور ان پر ہر طرح کے ظلم اور نا انصافی کو روا رکھا جا رہا ہے، اس کا

یہ اس دنیا میں کامیاب زندگی کی الف ب ہے اور عجیب بات ہے کہ ساری مسلم دنیا کے مسلم رہنماؤں میں غالباً کوئی ایک شخص نہیں جو اس حقیقت کو شعوری طور پر جانتا ہو، خواہ وہ عربی داں مسلمان ہو یا انگریزی داں مسلمان۔

مولانا شفیع مونس:- جہاد حق کے لیے اولین کوشش تو یہی ہونی چاہیے کہ مخاطب افراد، جماعتوں اور قوموں کو دعوت حق سے روشناس کیا جائے اور فتنہ و فساد سے باز نہ آئیں تو طاقت کے استعمال پر غور کیا جائے۔ اگر کامیابی کی توقع ہو تو طاقت کا استعمال کیا جائے ورنہ اصلاح حال کی کوششوں کے لیے حتی المقدور پر امن ذرائع اختیار کیے جائیں۔ اب یہ ہر اس قوم کے بارے میں دیکھنا ہوگا کہ کس قوم کو شر و فساد سے باز رکھنے کے لیے طاقت کا استعمال ضروری ہو گیا ہے یا نہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہ فی الواقع اس درجہ کی طاقت ہو چکی ہے جس کی بنا پر بہ اطمینان اس کا استعمال کیا جاسکے۔

مولانا عبدالوہاب خلیجی:- جہادی تنظیموں نے جو طریقے اپنائے ان کے علاوہ باہمی گفت و شنید، ڈائیلاگ اور بحث و مناقشہ کی راہ کھلی دینی چاہیے، موجودہ حالات میں یہ ایک حل وسط اور مشکلات و مصائب سے نجات کی بہترین شکل ہے۔ جہادی تنظیموں نے اپنے مقاصد کے حصول و تحفظ کے لیے جو طریقے اپنائے ہیں اس سے قطع نظر کہ وہ کیا ہیں؟ اور کس تنظیم نے کون سے طریقے اپنائے ہیں؟ میرے نزدیک موجودہ حالات میں باہمی گفت و شنید، بحث و مناقشہ اور دلائل کے ذریعہ ایک دوسرے کو مطمئن کرنے کی راہ، ایک موثر ترین طریقہ ہے اور گفتگو کے لیے ضروری ہے کہ گفتگو کے شرعی نقطہ نظر کو اچھی طرح سمجھتے ہوں اور فریق مخالف کی چالبازیوں اور ذہنی وسعت کو بھی سمجھتے ہوں۔ اس سے بہتر نتائج برآمد ہونے کی امید کی جاسکتی ہے اور یہ ایک حل وسط بھی ہے نیز امت کو مشکلات و مصائب سے نجات دلانے کی بہترین شکل بھی ہے۔

سوال:- (۷) حکم جہاد کے نفاذ اور اس کو عملی طور پر شروع کرنے کے لیے کسی امام، خلیفہ یا قائد کے تعین کا اسلامی طریقہ کیا ہے؟ اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟
مولانا یلین اختر مصباحی:- خلیفہ المسلمین یا سلطان اسلام اپنے علمائے کرام اور

دفاع کس طرح ممکن ہے؟

مولانا یلین اختر مصباحی :- اسلام دشمن طاقتوں کی قدیم عادت و روایت ہے کہ وہ صرف جہاد نہیں بلکہ اسلام اور عالم اسلام کو نہایت بے شرمی و ڈھٹائی کے ساتھ طعن و تشنیع کا نشانہ بناتی رہتی ہیں، جہاد کی غلط تعبیر و تشریح بھی اس کی ایک کڑی ہے۔ مگر اس کے ساتھ حالیہ دور میں ایک اضافہ یہ ہوا ہے کہ جب جس مسلم تنظیم کو یہ شریک طاقتیں چاہتی ہیں اسے جہادی کہہ کر اس کے ارکان و افراد کو مشق ستم بنانے لگتی ہیں۔ ایسی صورت میں دفاع کا کوئی نیا طریقہ نہیں بلکہ وہی پرانا طریقہ اپنانا ہوگا کہ اپنے آپ کو مذہبی، علمی، فکری، تجارتی، صحافتی، سیاسی، اخلاقی، عسکری ہر لحاظ سے اتنا مضبوط کر لیا جائے کہ کوئی آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ دیگر رائج الوقت جو بھی جائز و مناسب و مفید تدبیریں ہوں ان پر عمل کیا جانا چاہیے۔

مولانا وحید الدین خاں :- آٹھویں سوال کے بارے میں میں کہوں گا کہ اس کے دفاع کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مسلمان خود اپنی طرف سے ان تمام پر تشدد سرگرمیوں کو یکسر بند کر دیں جو موجودہ زمانے میں جہاد کے نام پر چل رہی ہیں۔ مذکورہ مسئلہ صرف مسلمانوں کے خود ساختہ جہاد کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس خود ساختہ جہاد کے ختم ہوتے ہی مذکورہ مسئلہ بھی اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

مولانا شفیع مونس :- مسلمانوں کے خلاف عالمی پیمانے پر جو سازشیں ہیں ان کے دفاع کی صحیح تدبیر یہ ہے کہ ایک طرف تو خود مسلمانوں کی طرف سے کہیں کوئی غلطی اور ناروا حرکت نہ ہونے پائے، ہر طرح کے حالات میں ان کے سامنے اسلامی تعلیمات کی روشنی ہو، خود ان کے درمیان صحیح بنیادوں پر اتحاد اور لوگوں اور قوموں کو حق و صداقت کی راہ دکھائی جائے۔

مولانا عبدالوہاب غلپی :- جہاد کے خلاف بین الاقوامی طور پر جو سازشیں رچی جا رہی ہیں وہ ان غلط فہمیوں اور اسلام دشمن افراد، جماعتوں اور حکومت کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔ اس کے دفاع کے لیے اسلام کے نظریہ جہاد، امن و سلامتی اور باہمی ربط و تعلقات کو عام کرنا چاہیے۔ اسلام کے نظام عدل و مساوات اور حقوق انسانی کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچانا

چاہیے، کتابی نظریات سے باہر نکل کر عملی شکل دینی چاہیے، نیز اسلامی معاشرہ میں عدل و قسط اور انسانی وقار کی عملی جھلک نظر آنی چاہیے۔

سوال :- (۹) مستشرقین اور یورپ کے منصوبہ سازوں نے اسلام کے پاکیزہ نظریہ جہاد کے خلاف امت مسلمہ کے دانشوروں اور نئی نسلوں کو ذہنی طور پر جو متاثر کیا ہے اس کی صفائی کس طرح ہو سکتی ہے؟

مولانا یلین اختر مصباحی :- مستشرقین و محققین و مفکرین و مؤرخین یورپ و امریکہ جس طرح نظریہ جہاد کا تعاقب اور اس کے بارے میں شوشے گوشے پیدا کر کے دنیا کو اور بعض مسلم روشن خیالوں یا جدید تعلیم یافتہ مسلم نسل کو جہاد سے بدگمان کرنا چاہتے ہیں وہ کوئی نئی بات نہیں، البتہ اس کے اندر تیزی ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ جہاد کی اصل حقیقت سے انہیں آگاہ کیا جائے۔ اس کے لیے کتب و رسائل اور میڈیا کا استعمال کیا جائے اور افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کیا جائے۔

اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے مغربی میڈیا اور مغربی طاقتوں کی ایک مخصوص ذہنیت ہے اور بین الاقوامی سطح پر شائع ہونے والی خبروں میں ان کا ہی کنٹرول ہوتا ہے۔ جب جس مسلم ملک، مسلم حکمران اور مسلم تنظیم کو چاہیں اسے نشانے بنا کر دنیا بھر میں بدنام کر دیں، ایسا روزمرہ کا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ جہاد، جہادی اور مسلمان کے بارے میں اپنے مطلب و مفاد کے مطابق ان کی پالیسی بنتی بگڑتی رہتی ہے۔ بیس بائیس سال سے افغانستان و عراق میں جو کچھ ہو رہا ہے اور کون کس وقت ان کا محبوب اور کس وقت ان کی بارگاہ کا مردود بن جاتا ہے اس کا حال کسے نہیں معلوم ہے؟

اسرائیل کی دہشت گردی سے سب نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ مقبوضہ عرب علاقے خالی کرنے کرانے کا کوئی نام بھی نہیں لیتا ہے۔ صبرا و شتیلا کی پیموں میں ہزاروں فلسطینیوں کا قتل عام کوئی دہشت گردی نہیں؟ فلسطینیوں کے منتخب لیڈر یا سرعرات کی تبدیلی کا اسرائیلی و امریکی مطالبہ اور ان کے ہیڈ کوارٹر کا محاصرہ کوئی دہشت گردی نہیں ہے؟ مارچ ۲۰۰۴ء میں شیخ احمد یلین کو اسرائیلی حکومت نے خاک و خون میں تڑپایا ہے یہ بھی کوئی دہشت گردی

مولانا یسین اختر مصباحی :- جہاد کے حکم و نفاذ کی بنیادی ذمہ داری اولوالامر کی ہے جس میں علماء و امراء دونوں شامل ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے عوام کو اس طرح کا فیصلہ لینے کا اختیار نہیں۔ جس ملک کے کچھ شہری بطور خود جہاد معنی ا قتال کی حرکت کریں اور اپنے ملک یا اس سے باہر کے امن و

سوال:- (۱۱) سماجی سطح پر ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا فکری رجحانات کیا رہا ہے؟
مولانا یٰسین اختر مصباحی:- ہندوستانی مدارس اسلامیہ صدیوں سے اپنے دینی و علمی کاموں میں مصروف ہیں۔ ان کا اصل مشغلہ درس و تدریس، وعظ و نصیحت اور تبلیغ و ہدایت ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے چھوٹے بڑے مدارس ہزاروں کی تعداد میں ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں جو عام مسلمانوں کے مالی تعاون و امداد سے اپنے مصارف و اخراجات پورے کرتے ہیں۔ اپنے وطن اور ملک کے تعلق سے ان کا فکری رجحان وہی ہے جو ایک عام ہندوستانی مسلمان کا ہے کہ اپنے ملکی مفاد کا تحفظ کرو، اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ لو، دل سے اسے چاہو اور پیار کرو اور ملکی وحدت و سالمیت کے خلاف کبھی کوئی قدم نہ اٹھاؤ۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی ہم آہنگی کے لیے یہ مدارس پر امن بقائے باہم کے اصول پر عمل پیرا ہیں اور یہ مدارس نہ سماج کے لیے اور نہ ہی ملک کے لیے کبھی کوئی پریشان کن مسئلہ بنے، بلکہ سماجی و ملکی مسائل کی گھنٹیاں سلجھانے میں ان مدارس نے ہمیشہ نمایاں کردار ادا کیا۔

مولانا وحید الدین خاں:- سماجی مسائل کے بارے میں مدارس اسلامیہ کا بظاہر کوئی فکری رول براہ راست نہیں ہے۔ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں کہ مدارس اسلامیہ کے سامنے شعوری طور پر سماجی فلاح کا کوئی نقشہ موجود تھا۔ تاہم اس سلسلہ میں بالواسطہ طور پر ان کی خدمات کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً فتاویٰ کے ذریعہ رہنمائی، مساجد میں خطاب جمعہ، عوامی جلسہ میں خطاب، مختلف تقریبات کے دوران اساتذہ اور طلبہ کا عوام سے انٹرایکشن، شادی بیاہ جیسی رسموں میں شرکت کے دوران وعظ و نصیحت اور رسالوں کے ذریعہ تعلیم و نصیحت وغیرہ۔ سماجی اعتبار سے ایک مستقل کام سوشل سروس ہے، مگر مدارس میں غالباً سوشل سروس کا کوئی باقاعدہ تصور موجود نہیں۔

مولانا شفیع مونس:- سماجی سطح پر ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا فکری رجحان یہ رہا ہے کہ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم بھی ہو اور صحیح تربیت بھی تاکہ وہ سن بلوغ کو پہنچ کر مسلم ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری ادا کر سکیں۔ مدارس کی دینی و معاشرتی حیثیت نہایت درجہ اہم ہے۔ ان کا بہتر سے بہتر نظم و انصرام ہونا چاہیے، اس کے بغیر کوئی دوسری صورت

نہیں ہو سکتی، جس سے صحیح معنوں میں بچے اور بچیوں کی دینی تعلیم و تربیت کی جاسکے۔
مولانا عبدالوہاب خلیجی:- سماجی سطح پر ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کے رجحان کو مزید واضح اور عملی طور پر باکردار بنانے کی ضرورت ہے۔

سوال:- (۱۲) اب تک ہندوستان کے مدارس میں دہشت گردی کی فکری یا عملی تعلیمات کا کوئی ثبوت نہ ملنے کے باوجود ملکی سطح پر کچھ حلقے مدارس اسلامیہ پر مسلسل دہشت گردی کے فروغ کے الزامات عائد کیے جا رہے ہیں، آخرا اس کے اسباب و عوامل کیا ہو سکتے ہیں؟ اور اس ڈھٹائی کے پیچھے ان کے کیا مقاصد پنہاں ہیں؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- ہندوستانی مدارس کے خلاف سنگھ پر یوار (آر ایس ایس)، وشو ہندو پریشد، بھاجپا وغیرہ) کے شور و غوغا اور انہیں دہشت گردی کا ڈھ کہنے کا ایک سیاسی اور ظاہری سبب تو یہ ہے کہ جب افغانستان میں امریکہ مخالف طالبان حکومت قائم ہوئی تو امریکی مشنری جس نے روس کے خلاف نبرد آزما مجاہدین کی بے پناہ مالی و عسکری مدد کی تھی اس نے زوال روس کے بعد اپنا مقصد پورا ہوتا ہوا دیکھ کر افغانستان سے بے رخی برتنی شروع کر دی تھی، وہ فوراً متحرک ہوئی اور مدارس کو طالبان کا سرچشمہ قرار دینا شروع کر دیا کہ یہ سارے طالبانی پاکستانی مدارس کی پیداوار ہیں۔ اس الزام کو ہندوستان میں سنگھ پر یوار نے دہرانا شروع کیا۔

یہ بات اگر کسی حد تک صحیح بھی ہو تو افغانستان اور پاکستان جو مسلم ممالک ہیں ان کے حالات و معاملات الگ ہیں۔ وہاں ایسا کرنے کے کچھ امکانات اور اسباب بھی ہیں جو ہندوستان میں قطعاً نہیں ہیں۔ اپنا ہندوستان جو ایک جمہوری اور ہندو اکثریتی ملک ہے اس کے سیاسی حالات ان دونوں ممالک سے مختلف ہیں اور اس طرح کی سرگرمیوں کی یہاں گنجائش بھی نہیں ہے۔ ہاں! کشمیر جو ایک مسلم اکثریتی صوبہ اور ساتھ ہی سرحد سے متصل علاقہ ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

باقی ہندوستان میں اب تک کوئی چھوٹا سا بھی ایسا واقعہ سامنے نہیں آیا کہ کسی بھی مدرسہ کی میچنگ باڈی یا ٹیچر اسٹاف یا اسٹوڈنٹس یونین کسی ملک دشمن سرگرمی میں ملوث پائی گئی ہو۔

غلط اور بے بنیاد ہے اور اس کے مقاصد بھی نہایت مذموم اور قابل نفرت ہیں۔

مولانا عبدالوہاب غلمی: ان الزامات کی بوچھاڑ کے اسباب اور الزامات کی وجہ بالکل واضح ہے کہ امت کو اس کے اصل سرچشمہ، علم و معرفت سے الگ کر دیا جائے۔ افراد امت کا رشتہ اس کے پاور ہاؤس سے کاٹ دیا جائے۔ مدارس نہیں رہیں گے تو اعدائے اسلام کو اپنے باطل نظریات کی اشاعت میں آسانی ہوگی اور مدارس کے نہ ہونے سے مسلمانوں کی بے راہ روی کی درستگی کرنے والے آہستہ آہستہ مفقود ہو جائیں گے اور انہیں اس بات کا پختہ یقین ہے کہ جب تک یہ مدارس زندہ پائندہ رہیں گے مسلمان مستحکم ہوں گے اور اعدائے اسلام اپنے باطل افکار و نظریات کی اشاعت میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔

سوال :- (۱۳) مدارس اسلامیہ کو اپنے وقار کے تحفظ اور ان سازشوں کے نتائج سے بچنے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟

مولانا سلیم اختر مصباحی: مدارس اسلامیہ کو اپنے نصاب تعلیم و تربیت کو مزید جامع و مؤثر بنا کر اپنی کارکردگی بہتر سے بہتر بنانی چاہیے، علم و اخلاق کا بلند نمونہ پیش کرنا چاہیے۔ کسی مشکوک و مشتبہ شخص کو اپنے قریب نہیں آنے دینا چاہیے۔ اپنا حساب و کتاب ہمیشہ درست رکھنا چاہیے۔ عام مسلمانوں کے درمیان اصلاح کردار و عمل کی کوشش تیز تر کر دینی چاہیے۔ اپنے طلبہ کو محنت و ریاضت، نظم و ضبط اور نفاست و نظافت کا عادی بنانا چاہیے۔ ان کے اندر ذوق مطالعہ، بلندی نگاہ اور فکر مستقبل کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیے اور قوم و ملت و معاشرہ و ملک کے حق میں اپنے آپ کو بہتر اور پرکشش شکل میں پیش کرنے کا ان کے اندر جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔

ان جوابات کی روشنی میں اسلام کے نظریہ جہاد کے ساتھ اس کے کئی تعلقات کی بھی تصویر صاف ہو جاتی ہے۔ جہاد کو دہشت گردی اور ٹیررزم کہنا خود ایک بہت بڑی دہشت گردی ہے۔ اسرائیل پوری سنگ دلی کے ساتھ فلسطینیوں کا جس طرح قتل عام کرتا ہے اور امریکہ نے مسلم ممالک کے گرد جس طرح کا محاصرہ کر رکھا ہے اور بلاشبوت و جواز کے فوجی عسکری اقدامات کرتا رہتا ہے یہ دور حاضر کی بین الاقوامی تباہ کن دہشت گردی ہے اور دنیا

اس لیے ان کے خلاف شکوک و شبہات کا اظہار اور ان کی وفاداری وطن پر سوالیہ نشان لگانا خود اس کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی شرانگیز و فتنہ خیز ذہنیت کارفرما ہے۔

یہ مدارس نہ دہشت گردی کی تعلیم دیتے ہیں نہ ہی یہ دہشت گردی کے اڈے ہیں، البتہ ایسا الزام لگانے والی مسلم دشمن تنظیمیں ضرور دہشت گردی کا ارتکاب کرتی رہتی ہیں جس کے اسباب و عوامل یہ ہیں۔

یہ مدارس مسلم معاشرہ کے لیے پاور ہاؤس کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے ان پر شب خون مارو۔ یہ مدارس مسلم بچوں کو اسلامی تعلیم سے آراستہ کر کے انہیں سچا پکا مسلمان بناتے ہیں اس لیے ان پر ناروا حملے کرتے رہو۔ یہ مدارس سارے مسلمانوں کی تہذیبی و ملی شناخت کا اہم مرکز ہیں اس لیے ان کی بنیاد پر ضرب لگاؤ۔ اردو زبان انہیں مدارس کی بدولت کافی حد تک مستحکم ہے اور روز بروز فروغ پاتی جا رہی ہے اس لیے اس مرکز کو تاخت و تاراج کر ڈالو وغیرہ وغیرہ۔

مولانا وحید الدین خاں: یہ صحیح ہے کہ مدارس میں دہشت گردی کی تعلیم و تربیت نہیں دی جاتی، اس اعتبار سے مدارس پر الزام لگانا غلط ہے، مگر اسی کے ساتھ یہ صحیح ہے کہ مدارس کے نظام میں عین وہی ذہن بنتا ہے جس کو جہادی ذہن کہا جاتا ہے۔ مدارس کے لوگوں کو امت مسلمہ کے مسائل میں پر امن عمل کا کوئی شعور نہیں۔ وہ دور جدید کے اس امکان سے بے خبر ہیں کہ ہر میدان میں حصہ داری (Sharing) کے اصول پر کام کیا جانا چاہیے۔ مدارس کے لوگ اب تک شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی سمجھتے ہیں کہ غیر مسلم لوگ کافر ہیں، غیر مسلم ممالک دارالکفر یا دارالحرب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ دوسری قومیں مسلمانوں کے خلاف دشمنی اور سازش میں مشغول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس کی طرف سے اب تک جہاد کے نام پر تشددانہ سرگرمیوں کی کھلی مذمت نہیں کی گئی اور نہ یہ اعلان کیا گیا کہ یہ سرگرمیاں جہاد نہیں ہیں بلکہ فساد ہیں۔ ایسی حالت میں مدارس کو اس معاملہ میں مکمل طور پر بے قصور نہیں کہا جاسکتا۔

مولانا شفیع مونس: اسلامی مدارس کے خلاف جو پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے وہ قطعی طور پر

غیر ہم اور برصغیر ہند کے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب مآذا خسرو العالم بانحطاط المسلمین جیسی بے شمار کتابیں مختلف زبانوں میں چھپی ہیں۔ اب سب کا مشترک انداز یہ ہے کہ ان میں مسلمانوں کے مسئلہ کا مطالعہ عروج اور زوال کی اصطلاحوں میں کیا گیا ہے۔

مطالعہ کا یہ طریقہ بلاشبہ غیر قرآنی ہے۔ قرآن کے مطابق عروج اور زوال دونوں اضافی ہیں۔ قرآن کے نزدیک دونوں حالتیں ہیں۔ یہ دونوں ہی کسی قوم کے لیے امتحان (Test) کے پرچے ہیں۔ خدا کبھی کسی قوم کو غالب کرتا ہے اور کبھی اس کو مغلوب کر دیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ دیکھنا مقصود ہوتا ہے کہ قوم جب کسی حالت میں مبتلا ہوئی تو اس نے کسی قسم کا رسپانس پیش کیا۔

مولانا شفیع مولنس:- مدارس اسلامیہ کی ایک طرف تو یہ کوشش ہونی چاہیے کہ تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر انتظام ہو اور دوسری طرف برادران وطن کے لیے دروازے کھلے ہوں جو غلط متعصبانہ ذہن نہیں رکھتے اور اپنی معلومات کے نتائج سے ہمدردانہ انداز میں صحیح طور پر ان لوگوں کو آگاہ کریں جو تعصب اور بدنیتی کی بنا پر فرقہ وارانہ فضا کو خراب کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

مولانا عبدالوہاب خلیجی:- مدارس اسلامیہ کے ذمہ داروں کو اپنے پیغام عمل اور جدوجہد پر پختہ یقین ہونا چاہیے اور اس کی پختگی کے لیے مزید کوششیں جاری رکھنی چاہئیں، غلط پروپیگنڈہ سے ہرگز متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ اس سلسلہ میں مدارس اسلامیہ کے دروازوں کو دوسروں کے لیے کھول دینا چاہیے تاکہ وہ خود آکر ان مدارس کی کارکردگی، سرگرمی اور جدوجہد کا جائزہ لے سکیں اور سماج کے تئیں ان کی خدمات کو محسوس کر سکیں۔ اس کے لیے علاقہ کے مختلف غیر مسلم اہل فکر و دانش، سماجی کارکنان، سیاسی اور عملی شخصیات کو گاہے بگاہے دعوت دے کر ان کے سامنے طلبہ کی علمی صلاحیتوں و لیاقتوں کا مظاہرہ کرنا چاہیے، نیز ایسے ڈائلاگ اور مذاکراتی پروگرام پیش کرنے چاہئیں جس سے ان کے سامنے اسلامی تعلیمات کی وضاحت اور اچھے اقدار کی نمائندگی ہو سکے۔ واللہ الموفق۔

کے انصاف پسند ممالک کو اس دہشت گردی کا کھل کر مقابلہ کرنا چاہیے اور انہیں لگام دینے کے لیے ہر ضروری و مفید اور جائز و مسلسل جدوجہد کا آغاز کر دینا ہی اقوام عالم کے مفادات کا تقاضا ہے، جس سے غفلت برتنا پوری دنیا کے لیے عظیم خسارہ و بحران کا باعث ہوگا۔

مولانا وحید الدین خاں:- میرے نزدیک سازش کا تصور محض ایک مفروضہ ہے۔ اسی طرح وقار کے تحفظ کا سوال بھی ایک فرضی سوال ہے۔ اس کا سادہ سا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہر مدرسہ نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اگر مذکورہ مفروضہ درست ہوتا تو مدارس کی یہ ترقیاں ہرگز ممکن نہ ہوتیں۔ اس معاملہ میں مدارس کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ سازش کے فرضی وہم سے باہر آجائیں اور معتدل ذہن کے تحت اپنا کام کریں۔

مدارس اسلامی تعلیم کا مرکز ہیں۔ اسلامی تعلیم اپنے آپ میں پرکشش ہے۔ وہ یہ طاقت رکھتی ہے کہ خود اپنے زور پر انسان کو اپنا گرویدہ بنا سکے۔ اسی حالت میں موجودہ زمانہ میں مدارس کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں وہ اصلاً خود مدارس کی اپنی غلطیوں کا نتیجہ ہیں۔ اس کمی کا ایک سبب یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ کے لوگ اپنی روایات کے تحت بند ماحول میں رہتے ہیں، وہ خارجی دنیا سے اختلاط نہیں کرتے۔ اس بنا پر ان کا حال یہ ہو گیا ہے کہ وہ نہ آج کی دنیا کو جانتے ہیں اور نہ جدید حالات کے مطابق اپنے ذہن کو تیار کرتے، اس علیحدگی پسندی کی بنا پر ان کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کا حقیقی حل صرف یہ ہے کہ مدارس کے ماحول کو بدلا جائے اور قدیم کے ساتھ جدید کو شامل کرنے کی کوشش کی جائے۔

مدارس کو یا امت مسلمہ کو موجودہ زمانہ میں جو مسائل درپیش ہیں ان کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ان کا سبب دراصل اس بنیادی خامی تک جاتا ہے کہ مدارس میں جو سوچ دی جاتی ہے وہ بجائے خود درست نہیں۔ اسی فکری خامی کے نتیجے میں وہ تمام چیزیں پیدا ہوئی ہیں جن کو مسائل کا نام دیا جاتا ہے۔ مسائل کا لفظ بظاہر خارجی اسباب کی طرف اشارہ کرتا ہے حالانکہ ہمارے مسائل تمام تر داخلی اسباب کا نتیجہ ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ملت کے موضوع پر ہزاروں کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ عرب دنیا کے امیر شکیب ارسلان کی کتاب لماذا تاخر المسلمون و تقدم

مولانا کلب جواد نقوی:-

اں کے سر کردہ عالم ور ہنما مولانا کلب جواد نقوی (لکھنؤ) کے پاس بھی جہاد اور دہشت گردی سے متعلق مذکورہ سوالات بھیجے گئے تھے مگر انہوں نے ان سوالات کے جواب میں مندرجہ ذیل تحریر روانہ کی۔ (خ-نورانی)

اسلام کے خلاف دشمنان اسلام ہمیشہ صف آرا رہے ہیں اور ان کا سب سے خطرناک ہتھیار اسلام کی تصویر مسخ کرنے کے لیے غلط پروپیگنڈہ رہا ہے۔ پہلے وسائل محدود ہونے کی وجہ سے یہ ہتھیار محدود پیمانے پر استعمال ہوتا تھا، لیکن آج الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے اس اسلحہ کو انتہائی خطرناک حد تک وسعت مل گئی ہے، آج کل سب سے زیادہ جو پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے وہ اسلام کے انتہائی مقدس اور پاکیزہ فریضہ اور عبادت ”جہاد“ کے خلاف ہے۔ ذہنوں میں زہر گھولا جا رہا ہے کہ اسلام دہشت گردی کا مذہب ہے جس میں حکم ہے کہ غیر مسلموں کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔ جہاد کا معنی قتل کرنا نہیں ہے، قتل اور جنگ کے لیے قرآن مجید میں لفظ قتال استعمال کیا گیا ہے۔ جہاد ”جہد“ سے بنا ہے جس کے معنی محنت یا مشقت کے ہیں اور اصطلاح میں اپنی ساری توانائیاں اور طاقتوں کو اعلائے کلمہ اسلام اور اللہ کی راہ میں خرچ کر دینے کا نام جہاد ہے۔ اسلام کی سر بلندی کے لیے اور اللہ کی راہ میں طاقت کا صرف میدان میں بھی ہو سکتا ہے اور بند کمرے میں بھی۔ جہاد ایک عنوان عام ہے جس میں قتال شامل ہے، خداوند عالم نے انسان کو فقط بازوؤں کی طاقت نہیں دی ہے، لہذا جہاد کا دائرہ صرف بازوؤں کی طاقت کے استعمال تک ہی محدود نہیں رہے گا۔ انسان کو بولنے کی طاقت، انگلیوں کو لکھنے کی طاقت، نفس کو جذبات اور خواہشات سے مقابلہ کرنے کی طاقت، ذہن و عقل کو سوچنے اور فکر کی طاقت، قدرت کی عطا ہوتی ہے۔ انہیں سب طاقتوں کا اللہ کی راہ میں استعمال کا نام جہاد ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے ”وجاہدوا باموالہم و انفسہم“، تو مال کے ذریعے بھی جہاد ہوتا ہے یعنی اللہ کی راہ میں مال کو صرف کرنا بھی جہاد ہے۔ اسی طرح رسول کا ارشاد ہے ”الکساد لعیالہ کالمجاہد فی سبیل اللہ“ اپنے خاندان اور متعلقین کے لیے رزق کا حصول بھی جہاد ہے۔ اگر کسی نے اندھیرے میں ایک شمع بھی روشن کر دی تو یہ

اندھیرے کے خلاف جہاد ہے، کسی نے اسکول یا مدرسہ قائم کیا تو یہ جہالت کے خلاف جہاد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو نظر میں رکھتے ہوئے جو کام بھی ہو وہ جہاد ہے، کیونکہ جہاد اپنی توانائیوں کو راہ الہی میں صرف کر دینے کا نام ہے۔ اب اگر میدان جنگ میں جانا پڑے اور اسلحہ سے جنگ ضروری ہو جائے تو یہ رہ جہاد کی قسم ہے، جسے قرآن مجید نے قتال کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ اگر جہاد صرف تلوار سے ہوتا تو عورتیں جہاد کے مقدس فریضہ سے محروم رہ جاتیں۔ اسلام میں بحالت مجبوری اور دفاعی ضرورتوں کے لیے اسلحہ اٹھانے کی اجازت ہے، اسی لیے قتال کے سلسلے میں جو پہلی آیتیں نازل ہوئیں وہ بعثت رسالت مآب کے تقریباً ساڑھے چودہ سال بعد۔ پہلی آیت ”اذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا“ نازل ہوئی جس کا مطلب ہے ان لوگوں کو اجازت دی جاتی ہے جن سے جنگ جاری ہے اور کیوں کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو لڑنے کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور ان سے جنگ چھیڑی گئی ہے تو آیت کریمہ خود بتا رہی ہے کہ جنگ کی ابتدا مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوتی ہے بلکہ دشمنان اسلام کی طرف سے، اسی طرح دوسری آیت کریمہ ہے ”وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا“ اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑ رہے ہیں اور دیکھو جنگ میں حد سے آگے نہ بڑھنا۔ یہ آیت بھی ثابت کر رہی ہے کہ جنگ کی ابتدا کافروں کی طرف سے ہوتی ہے اور مسلمانوں کو دفاع کا حکم دیا جا رہا ہے، یہ آیت بتا رہی ہے کہ کس راہ میں لڑو، کس سے لڑو اور کس حد تک لڑو۔ اسلام میں جنگ کی ابتدا کی اجازت نہیں ہے اور رسول اسلام کی جتنی جنگیں تھیں وہ سب دفاعی تھیں۔ اگر اسلام کے اس اصول کو ساری دنیا تسلیم کر لے کہ جنگ میں ابتدا نہیں ہوگی تو دنیا سے جنگ کی لعنت خود بخود ختم ہو جائے گی۔

”لا تعتدوا“ کا قرآنی حکم مسلمانوں کو پابند کر رہا ہے کہ دفاع بھی کریں تو صرف اتنا کہ جتنی ضرورت ہے اور طاقت کا استعمال بھی صرف اس حد تک کہ فتنہ دفع ہو جائے۔ حکم ہے کہ کسی کنبہ کو نہ مارو، زخمیوں کو قتل نہ کرو، خواتین کا احترام کرو، مذہبی لوگوں کو قتل نہ کرو، کھیتیاں اور درخت تباہ نہ کرو اور اگر مقابلہ کرنے والے صلح پر راضی ہو جائیں تو تم بھی صلح کر لو۔ اس

مکرمی! سلام مسنون

مرسلہ سوالات کے بیشتر جواب دارالافتاء سے متعلق ہیں، مگر وہاں ایک ہفتہ جواب کے لیے درکار ہوگا، اگر آپ فرمائیں تو دارالافتاء بھیج دوں۔

مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا مسئلہ جہاد نہیں ہے بلکہ اپنے جان و مال کی حفاظت، اہل و عیال، عزت و آبرو کا تحفظ، تعلیمی ترقی، معاشی استحکام، اپنے مستقبل کی تعمیر نو کی فکر، یہ سب امور امن و سکون کے طالب، اکثریت سے خوش گوار تعلق، ملک کو اپنا وطن سمجھنا اور اس کے برے بھلے کی فکر وغیرہ میں ہے، یہ بھی گزارش ہے کہ غیر ضروری بلکہ خلاف مصلحت سوالات ملت کی پسماندگی اور در ماندگی کے لیے داروئے شفا نہیں، بلکہ ہلاکت میں مبتلا کرنا ہے جو ملت کے واقعی غم خوار سے ممکن نہیں۔

(۲) مدارس کے سلسلہ میں ہمیشہ جدید طبقہ یہ کہہ کر مطعون کرتا رہا کہ ناکارہ پیدا کیے جا رہے ہیں، قلعہ اعدویوں کی فصل بوئی جا رہی ہے، مسجد میں صفیں بجھانے والے، اذان اور نماز پڑھانے والے تیار کئے جا رہے ہیں جن کا کوئی مستقبل نہیں، بلکہ وہ ملت کے لیے بوجھ ہیں، کاش کہ اب معترضین کی آنکھیں کھلیں اور ان نکتہ چینیوں کا دروازہ بند ہو، اگر یہ مدارس اتنے ہی مفلوج اور بے کار تھے جتنا سمجھا گیا اور سمجھایا گیا تو آج دانا دشمن اسے شہرِ رگ سمجھ کر حملہ آور نہ ہوتا، علاج اس کا صرف یہ ہے کہ ان مدارس کو مستحکم کیا جائے اور مدارس مخالف طبقہ کو مدارس کے نظام کا قریبی مطالعہ کا موقع دیا جائے، مدارس اپنے جلسوں میں سیکولر افراد کو برابر بلائیں، وہ جو کچھ ہمارے اسٹیج سے کہیں گے وہ ہمارے لیے مضبوط شہادت ہوگی، تمام مدارس متفقہ طور پر مدارس کے خلاف پروپیگنڈہ کا مثبت جواب دیں، لیکن یہ سب کچھ اپنے دین، اپنا تشخص، اپنی شناخت کو باقی رکھتے ہوئے اپنی مفید روایات کو سنبھالتے ہوئے۔ ایسا ہرگز نہ ہو کہ اس میل ملاپ میں وہ عبرت ناک منظر سامنے آئے کہ ”ہر کہ درکان نمک رفت نمک شد“ اس اہم نکتہ کو نہ بھولنا چاہیے کہ ہندوستانی مسلمان موجودہ حالت میں موثر کردار تو پیش نہیں کر رہا ہے تو یہ بھی غنیمت ہوگا کہ کم از کم غیر ضروری حد تک متاثر نہ ہو۔

□□□

کا مطلب ہے اسلام میں جنگ بحالتِ مجبوری ہے اور اسلام صلح و امن کا مذہب ہے۔

اسلام میں کسی اچھے سے اچھے اور نیک سے نیک کام کے لیے بھی کسی بے گناہ کے خون کا ایک قطرہ بھی بہانا جائز نہیں، چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ کمیونزم کا نظریہ ہے کہ صرف ہدف اور مقصد صحیح ہو تو حصول کے لیے صحیح غلط ہر طریقہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اسلامی نظریات کے مطابق ہدف بھی صحیح ہونا چاہیے اور ہدف کو حاصل کرنے کا راستہ اور طریقہ بھی جائز ہونا چاہیے۔ لہذا جو تنظیمیں دشمنانِ اسلام کا مقابلہ کر رہی ہیں ان کو ہمیشہ یہ اسلامی حکم پیش نظر رکھنا چاہیے کہ کبھی جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو اپنے حملوں کا نشانہ نہیں بنائیں۔ اسلام میں صرف گنہگار کو سزا ہے، کسی گنہگار کے بدلے میں کسی بے گناہ کا ایک قطرہ خون بہایا نہیں جاسکتا۔ آج جو ہم کے دھماکے ہوتے ہیں ان میں عموماً عوام نشانہ بنتے ہیں جس کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ دشمنانِ اسلام کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کا زبردست مواد مل جاتا ہے اور عورتوں اور بچوں کی لاشوں کو مسلسل ٹیلی ویژن پر دکھا کر اسلام کے خلاف نفرت کا زہر پھیلاتے ہیں۔

مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ میڈیا پر اسلام دشمنوں کا قبضہ ہے، اس لیے جو مسلمانوں پر ظلم ہوتا ہے اسے میڈیا میں چھپایا جاتا ہے، لہذا اس وقت، وقت کی سب سے بڑی ضرورت مسلم میڈیا کا قیام ہے۔ کروڑوں عربوں ڈالر یورپ اور امریکہ میں عیاشی پر صرف ہو جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف زبانوں میں ٹی وی چینل اور اخبارات مسلمانوں کی طرف سے ہوں تاکہ دشمنانِ اسلام کے غلط پروپیگنڈے کا موثر ٹوڑ ہو سکے۔

مولانا انظر شاہ کشمیری:-

دیوبندی جماعت کے رہنما اور دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا انظر شاہ کشمیری کے پاس بھی مذکورہ سوالات روانہ کیے گئے تھے، مگر انہوں نے ساری ذمہ داری دارالافتاء پر ڈال کر جواب دینے کا عذر پیش کیا اور مندرجہ ذیل تحریر بشکل مراسلہ روانہ کی۔ (خ-نورانی)

اجتہاد و تقلید

مسئلہ اجتہاد و تقلید انہی مسائل میں ہے جن کو سمجھے بغیر ہر کوئی اظہار خیال کرنا اپنا فطری حق سمجھتا ہے۔ اگر اس مسئلے میں ابن حزم، ابن تیمیہ، ابن قیم اور البانی جیسے افراد امت کے اجماعی موقف سے الگ راہ نکالنے کی کوشش کریں، تو ان کے ذاتی دینی مطالعے کے پیش نظر انہیں نظر انداز بھی کر دیا جائے لیکن حیرت تو یہ ہے کہ آج ہر بالشتیہ جسے نہ فقہ و حدیث کے معنی معلوم ہیں اور نہ قیاس و اجتہاد کا مفہوم، آستین چڑھائے منصب اجتہاد پر براجمان ہونے کے لیے بے قرار نظر آتا ہے، جس کے نتیجے میں ۹۵/۱۰۰ فی صد یا اس سے زائد افراد مقلدین و غیر مقلدین کے اصل اختلاف سے ناواقف ہیں۔ اسی ناواقفی کو ختم کرنے اور معلومات و حقائق عام کرنے کے لیے ہم نے اپریل ۲۰۰۶ء میں جام نور کا ۳۰۰ صفحات پر مشتمل خصوصی شمارہ ”اجتہاد و تقلید“ شائع کیا اور مختلف مکاتب و مسالک کی سرکردہ ذی علم و فہم شخصیات کے انٹرویوز شامل کیے، تاکہ اجتہاد و تقلید پر پڑے جہالت کے دبیز پردے چاک ہوں اور حقیقت عوام کے حضور بے نقاب ہو جائے۔ عصر حاضر کے اس متنازع ترین موضوع کے تعلق سے ۱۵ سوالات پر ترتیب وار جن چار شخصیات کے جوابات حاضر ہیں وہ یقیناً معاصر مذہبی و علمی حلقے میں محتاج تعارف نہیں ہیں اور ان کی باتوں کا بہر حال اپنے اپنے حلقوں میں وزن اور اعتبار ہے۔ یہ چار نام یہ ہیں:

- (۱) مولانا محمد احمد مصباحی، صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی
- (۲) مولانا عبدالوہاب خلیفی، سابق ناظم عمومی مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، دہلی
- (۳) مولانا وحید الدین خان، صدر اسلامی مرکز دہلی
- (۴) مولانا عبدالحمید نعمانی، سکریٹری و ترجمان جمعیتہ العلماء ہند، دہلی۔

یہ یقینی بات ہے کہ ہر شخص بیک وقت ان کی تمام باتوں سے اتفاق نہیں کر سکتا، لیکن ہمارا وجدان ہے کہ طالب حق کی نیت اگر درست ہو تو اسے حقیقت کا سراغ مل ہی جاتا ہے۔

سوال (۱): - قیاس واجتہاد کی حقیقت کیا ہے؟ اور کتاب وسنت کے ہوتے ہوئے

اس کی ضرورت کیوں پڑی؟

مولانا محمد احمد مصباحی: - قیاس کا لغوی معنی اندازہ کرنا اور برابری دکھانا اور فقہاء کی اصطلاح میں قیاس یہ ہے کہ جو حکم کسی امر کے لیے کسی علت کی بنیاد پر نص سے ثابت ہے وہی حکم اسی علت کی بنیاد پر دوسرے ایسے امر کے لیے ثابت کرنا جس کے بارے میں نص وارد نہیں۔

اجتہاد کے لغوی معنی کوشش و محنت صرف کرنا اور فقہاء کی اصطلاح میں فقیہ کا کسی حکم شرعی نظری کے استخراج کے لیے پوری طاقت صرف کرنا۔ کتاب وسنت سے بے واسطہ قیاس استخراج احکام پر بھی اجتہاد کا اطلاق ہوتا ہے اور منصوص کی روشنی میں علت کی بنیاد پر قیاس کے ذریعہ غیر منصوص کا حکم نکالنے کو بھی قیاس کہا جاتا ہے۔

قیاس کے ارکان و شرائط کی تفصیل اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، یہاں خاص طور سے بتانے کی بات یہ ہے کہ قیاس کسی ایسے ہی معاملہ میں ہو سکتا ہے، جس کا حکم کتاب وسنت میں صراحتہ بیان نہ ہوا ہو، اگر اہل قیاس نے قیاس سے اسی وقت کام لیا ہے، جب کتاب وسنت، اجماع امت یا فقہائے صحابہ کے اقوال سے مسئلہ کا حل دست یاب نہ ہوا ہو۔

کتاب وسنت کے ہوتے ہوئے قیاس واجتہاد کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں صرف اصول و کلیات اور بعض جزئیات صراحتہ بیان ہوئے ہیں، اصول کی روشنی میں فروع کا بیان اور جزئیات کی تفصیل قرآن نے بیان رسول اور فکر مجتہدین کے سپرد کر دی ہے، ارشاد ہے: وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لَتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نَزَلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (سورہ نحل آیت ۴۴) ”اور اے رسول ہم نے تم پر یہ ذکر نازل فرمایا تاکہ لوگوں کے سامنے تم اسے واضح کرو جو ان کی طرف اتارا گیا اور کہیں وہ خود بھی فکر کریں۔“

واقعہ بھی یہی ہے کہ احادیث کریمہ میں اگرچہ بے شمار احکام اور اصول و فروع کا ذکر

ہوا، پھر بھی عہد صحابہ سے ہی روز بروز ایسے مسائل پیش آتے رہے جن کا جواب صحابہ کرام کو بھی حدیث نبوی میں نہ ملا اور قیاس واجتہاد کا سلسلہ جاری ہوا، یعنی منصوص کی روشنی میں غیر منصوص امور کے احکام کا استخراج ہونے لگا۔

مولانا عبد الوہاب خلیفی: - قیاس: ادلہ شرعیہ میں چوتھے نمبر کی دلیل ہے۔ فرع، اصل، علت اور حکم اس کے ارکان اربعہ ہیں۔ جب کسی مسئلہ میں کتاب اللہ، سنت مصطفیٰ ﷺ اور اجماع سے دلیل ثابت نہ ہو تو قیاس حجت شرعی ہوتا ہے۔ بشرطیکہ قیاس کسی نص یا اجماع سے متصادم نہ ہو نیز جس اصل پر فرع کو محمول کیا جا رہا ہے وہ اصل، نص یا اجماع سے ثابت ہو۔ قیاس پر قیاس صحیح نہیں ہے، نیز علت اور حکم کے درمیان شرعی طور پر معتبر اور مناسب معنی پایا جاتا ہو۔ اسود اور ابیض جیسے طردی اوصاف علت نہیں ہو سکتے۔ تفصیل کے لیے کتب اصول کا مراجعہ کیا جائے۔

اجتہاد: کسی حکم شرعی کو معلوم کرنے کے لیے، غایت درجہ کوشش صرف کرنے کا نام ہے اور اس قسم کے جہد صرف کرنے والے کو مجتہد کہا جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے اجتہاد کے لیے ضروری حد تک ادلہ شرعیہ سے واقف ہو، مثلاً آیات احکام، احکام سے متعلق احادیث اور ان کی صحت و ضعف کا تحقیقی علم رکھتا ہو، نسخ و منسوخ اور مواقع اجماع و اختلاف پر پوری طرح مطلع ہو اور عربی زبان و لغت اور اصول فقہ و استنباط سے بھی بخوبی واقف ہو۔ ایسا شخص اگر معرفت حق کے لیے کوشش کرتا ہے اور جو رائے اس کے سامنے حق ہو کر ظاہر ہوتی ہے وہ کتاب وسنت کے دلائل اور معانی شرعیہ کی روشنی میں درست ثابت ہوتی ہے تو وہ دوسرے اجر کا مستحق ہوتا ہے ورنہ اکہرے اجر کا، جیسا کہ حاکم وقت کے اجتہاد کے متعلق صحیحین میں عبد اللہ بن عمر و ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت آئی ہے۔

قیاس واجتہاد کی ضرورت: یقیناً کتاب وسنت کے دلائل سے جو شخص جس قدر زیادہ واقف ہوگا اس کو اجتہاد و قیاس کی اتنی ہی کم ضرورت پڑے گی، تاہم مسائل متحدہ و متنوعہ کے پیش نظر اجتہاد کی ضرورت و اہمیت سے انکار ممکن نہیں، بشرطیکہ مجتہدین امت اجتہاد کی بنیادی اور لازمی شرطوں سے متصف ہوں۔

مسائل صراحت سے مذکور ہیں۔ دین کے مکمل ہونے کا معنی یہ ہے کہ اصولی طور پر قرآن نے تمام مسائل کا حل پیش کر دیا ہے، مثال کے طور پر کسی فرد یا قوم سے مقابلے کی بات، قرآن نے بتایا کہ اس کے لیے ایسی تیاری ہو کہ وہ مرعوب ہو جائے۔ اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح کے اسلحہ یا وسائل جنگ مد مقابل کے پاس ہوں اس نوعیت کے اسلحے آپ کے پاس بھی ہونے چاہیے، اب اگر آپ کے مقابل کے پاس ایٹم بم ہے یا لیزر بم ہے تو آپ تلوار سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تو اب اگر کوئی کہے کہ قرآن نے ایٹم بم رکھنے کا حکم تو نہیں دیا ہے، اس لیے مسلم ممالک کو اس کی کیا ضرورت؟ تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ قرآن نے اصول بتا دیا ہے، اس اصول کی روشنی میں علم دین کے ماہرین جزئیات کی تحقیق کرتے ہیں اور اس کے مطابق حکم دیتے ہیں۔ قرآن نے ایک اصول دے دیا کہ ایسی تیاری ہو کہ مد مقابل مرعوب ہو سکے اور ظاہر ہے کہ آج کی دنیا میں اس کے لیے ایٹم بم کی ضرورت ہے۔

اس طرح کے جدید مسائل جو سامنے آتے ہیں ان میں بہر حال رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، ان کے حل کی ضرورت ہوتی ہے۔ حل مسائل کی دو صورتیں سامنے آتی ہیں۔ کبھی مجتہدین امت اس نئے مسئلے میں متفق ہو جاتے ہیں اور کبھی ان کے آپس میں اختلاف رونما ہو جاتا ہے۔ پہلی صورت کو اصطلاح شریعت میں اجماع کہتے ہیں اور دوسری صورت کو قیاس سے تعبیر کرتے ہیں۔ اتفاق اور اجماع والی صورت میں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، وہ حکم واجب الاتباع ہوگا۔ ہاں! اختلاف کی صورت میں یہ ہوگا کہ سارے مجتہدین کا اور ان کی آراء کا احترام کیا جائے گا، لیکن ایک شخص اتباع ان میں سے کسی ایک ہی کا کر سکتا ہے۔ ایک وقت میں سب کی بات مان لے یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

جس طرح انبیائے کرام بہت سے ہیں اور ہم پر ہر ایک کا احترام واجب ہے، لیکن جہاں تک ماننے کی بات ہے تو ہم اپنے ہی نبی کو مانیں گے، دوسرے کو نہیں۔ ا کی پیروی کا بھی یہی حال ہے کہ ہم احترام تو سب کا کریں گے، لیکن مانیں گے اپنے ہی امام کی۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ تقلید غیر منصوص مسائل میں ہی ہوتی ہے، جو مسائل کتاب و سنت میں منصوص ہیں، جیسے خدا ایک ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے

مولانا وحید الدین خاں:- فقہا چار مصادر شریعت مانتے ہیں، قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔ میرے نزدیک مصادر شریعت تین ہیں، کتاب، سنت اور اجتہاد، میرے نزدیک قیاس اور اجماع دونوں اجتہاد کے دو درجے ہیں۔ اجماع کے بغیر جو اجتہاد ہو وہ قیاس ہے اور جس اجتہاد پر عمومی اتفاق ہو جائے وہ اجماع ہے۔

اجتہاد دین کی ایک فطری ضرورت ہے، کیوں کہ ساری باتیں نص میں نہیں ہو سکتیں، نص میں صرف بنیادی باتیں ہی ہوتی ہیں۔ نئے حالات میں ضرورت ہوتی ہے کہ منصوص احکام کا انطباق نئے حالات میں تلاش کیا جائے۔ اسی کا نام اجتہاد ہے۔ یہ اجتہاد ہمیشہ جاری رہتا ہے، اسی لیے بخاری میں یہ روایت ہے کہ صحیح اجتہاد پر دگنا ثواب ہے اور اجتہادی خطا پر ایک ثواب، بشرطیکہ نیت درست ہو۔

مولانا عبدالمجید نعمانی:- قرآن نے دین کے تعلق سے کہا ہے الیوم اکملت لکم دینکم وأتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً دین مکمل ہے اور جب دین مکمل ہے تو کسی بھی شرعی مسئلے میں جس کا تعلق سماج سے ہو یا انسانی ضروریات سے ہو تو اس کا جواب نفیاً یا اثباتاً ہاں یا نہیں میں ملنا چاہیے۔ بعد کے دور میں امت کے سامنے جو مسائل پیدا ہوئے یا درپیش ہوں گے، مثال کے طور پر انشورنس کا مسئلہ ہے، شیر کا ہے، اعضاء کی پیوند کاری کا ہے، بین الاقوامی حالات کے پیش نظر جو خارجی و داخلی سطح پر مسائل پیدا ہوئے، دوسرے فرقے سے ہمارے تعلقات کس نوعیت کے ہونے چاہیے، شرعی نقطہ نظر سے ہم دوسروں سے کہاں تک قریب ہو سکتے ہیں اور دوسروں کو کہاں تک قریب لا سکتے ہیں، اسی طرح ملک و سماج کے مشترک مسائل، اب ان مسائل کے تعلق سے اگر پوچھا جائے کہ بتائیے قرآن میں یا حدیث میں ان کے تعلق سے کیا حکم ہے؟ تو ظاہر ہے کہ کتاب و سنت کے اندر ان کی صراحت نہیں ہے، تو جب نفی یا اثبات میں ان مسائل کے تعلق سے کتاب و سنت سے جواب نہیں ملا تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین مکمل کیسے ہوا؟ مکمل کا مطلب ظاہر اتو یہی ہے کہ اب اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہ ہو۔ حالاں کہ یہاں ضرورت پڑ رہی ہے۔ تو اب یہیں سے ہمیں سمجھنا ہوگا کہ دین کے مکمل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس میں سارے

رسول ہیں۔ تو ان میں ہم کسی کی تقلید نہیں کریں گے، یہ حکم تو صراحت کے ساتھ موجود ہے ہی۔ اسی طرح ایسے مسائل جن کی صراحت تو قرآن میں ہے لیکن الفاظ کے معنی کے تعین میں اختلاف ہو گیا، قراء ایک ہی لفظ ہے جس کا معنی کسی امام نے حیض بتایا جبکہ دوسرے نے طہر بتایا، نکاح کا اصلی معنی وطی ہے لیکن عقد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، تو تعین معنی میں علماء کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ اب ان میں ہر ایک کی بات تو مان نہیں سکتے، کیوں کہ یہ ناممکن ہے، اس لیے کسی ایک پر اعتماد کرنا ہوگا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ لوگ حضور کے زمانہ سے قریب رہے، پھر دین کو ہم سے زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا، یہی تقلید ہے جو صرف دین ہی میں نہیں دوسری صنعت و حرفت مثلاً خیاطی، معماری وغیرہ میں کی جاتی ہے۔ تقلید کے حوالے سے ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مقلدین کتاب و سنت کے حکم کی بجائے مجتہد کے حکم کی پیروی کرتے ہیں، حالاں کہ یہ بہت بڑی چوک ہے، کیوں کہ کوئی بھی مجتہد اپنی طرف سے حکم صادر نہیں کرتا، وہ تو نص کے اندر جو پوشیدگی ہوتی ہے، اس کو ختم کر کے کتاب و سنت کے حکم کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اس کی حیثیت اس شخص کی ہے جو بادام کا چھلکا توڑ کر مغز نکالتا ہے، وہ بادام پیدا نہیں کرتا، صرف چھلکا ہٹا دیتا ہے، اسی لیے اصول فقہ کی کتاب میں مجتہد کی تعریف میں آیا ہے **هو مظهر للحکم الشرعی وہ حکم ظاہر کرتا ہے، صادر نہیں کرتا۔**

قرآن نے خدا و رسول کے بعد ایک ایسے طبقے کا ذکر کیا ہے، جس کی طرف لوگ رجوع کرتے ہیں اور اس کی تعبیر استنباط سے کی ہے اور استنباط مسائل ہی دراصل اجتہاد ہے، استنباط لغت میں پانی نکالنے کو کہتے ہیں اور پانی نکالنے والا پانی پیدا نہیں کرتا، بلکہ زمین کے اندر پانی موجود ہوتا ہے، بس وہ مٹی کھود کر اس پانی تک رسائی حاصل کر لیتا ہے، مجتہد کا عمل بھی درحقیقت اسی نوعیت کا ہے۔

سوال (۲): مجتہدین کے مختلف طبقات کے کیا معنی ہیں؟ اور کیا آج بھی مجتہدین کا کوئی طبقہ موجود ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- ہر فقہ کی علمی وسعت اور اجتہادی قوت یکساں نہیں، علمی صلاحیت اور احکام کے استخراج و بیان کے لحاظ سے فقہاء میں فرق مراتب ہے، فقہاء کے

طبقات اور ان کی مثال میں فقہاء کے نام ذکر کرتے ہوئے، اسی فرق مراتب کو واضح کیا گیا ہے، یہ ہمارے فقہاء کے کرام کی دیانت و امانت ہے کہ جو فقہ جس درجے کا تھا، اسی حد پر رہ کر اس نے اپنا کام کیا اور بعد کے فقہاء نے اس فقہ کے کام کی نوعیت اور اس کا دائرہ عمل دیکھ کر اس کے مرتبے کا تعین کیا، لیکن اگر کوئی شخص اپنا مرتبہ اپنی حیثیت سے ہزار گنا اونچا باور کر چکا ہو تو ممکن ہے اسے یہ تعین مراتب اور تفریق درجات پسند نہ آتی ہو اور اپنے کو امام اعظم کا ہم پلہ جتانے اور بالکل مساوی وہم قامت بتانے کی راہ میں اسے بہت بڑی رکاوٹ سمجھتا ہو۔ مگر حق یہی ہے کہ سب فقہاء و مجتہدین ہم پلہ اور ہم مرتبہ نہیں۔

علامہ محمد امین بن عابدین شامی نے شرح عقود رسم المفتی میں فقہاء کے سات طبقات ابن کمال پاشا کے حوالے سے بیان کیے ہیں۔

اول: مجتہدین فی الشرح، جیسے اربعہ اور ان کے امثال جنہوں نے اصولی قواعد وضع کیے اور اولہ اربعہ (کتاب، سنت، اجماع، قیاس) سے احکام نکالنے کے اصول مقرر کیے اور اصول و فروع میں کسی مجتہد کی تقلید نہ کی۔

دوم: مجتہدین فی المذہب جیسے امام ابو یوسف، امام محمد اور دیگر تلامذہ امام اعظم یہ اپنے استاذ کے مقررہ قواعد کے مطابق اولہ اربعہ سے استخراج احکام پر قادر ہوتے ہیں، یہ اصولی قواعد میں اپنے استاذ کے مقلد ہوتے ہیں اگرچہ بعض فروع میں استاذ سے اختلاف کرتے ہیں۔

سوم: مجتہدین فی المسائل، یہ اصول و فروع کسی میں امام کی مخالفت کی صلاحیت نہیں رکھتے لیکن جن مسائل میں امام سے کوئی روایت نہ آئی ہو، ان کے احکام اپنے امام کے مقررہ اصول و قواعد کے مطابق استنباط کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ جیسے امام ابو جعفر طحاوی، امام کرخی، فخر الاسلام بزدوی وغیرہم۔

چہارم: اصحاب تخریج، جیسے ابو بکر جصاص رازی وغیرہ، یہ اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے، لیکن اصول سے پوری آگاہی اور مآخذ سے کامل آشنائی رکھتے ہیں، اس لیے امام یا ان کے اصحاب سے منقول کسی مجمل قول کی تفصیل یا کسی محتمل حکم کی توضیح اپنی رائے اور وسعت نظر کی بنیاد پر کر سکتے ہیں۔

اصولی احکام کی روشنی میں حل کرنے کا نام ہے، نئے نئے مسائل زمانہ گزرنے کے ساتھ پیدا ہوتے رہتے ہیں تو ظاہر ہے اجتہاد کا تسلسل بھی برقرار رہے گا، اسی لیے علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے لکھا ہے کہ اجتہاد قیامت تک ہوتا رہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ایک بنیادی بات یہ ہے کہ دین کے جو عمومی مسائل ہیں، اربعہ نے تمام مسائل کا حل پیش کر دیا ہے۔ اربعہ کے علاوہ بھی امام اوزاعی وغیرہ دوسرے اہل علم نے مسائل کی فقہ مدون نہیں ہو سکی، اربعہ کی فقہ مدون شکل میں موجود ہے، جو دین کے عمومی مسائل کے تمام جزئیات کا حل بناتی ہے، تو یہ حضرات مجتہد مطلق ہیں اور آج کے زمانے میں نہ تو اجتہاد مطلق کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کے لیے جس قسم کی صلاحیت درکار ہے، وہ کسی میں موجود ہے، ہمیں خدا کی قدرت سے انکار نہیں، آج بھی ایسی صلاحیت کا انسان پیدا ہو سکتا ہے، لیکن موجود دین میں اس کی مثال ناپید ہے۔ خلاصہ یہ کہ دین کے عمومی مسائل میں اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے، رہے وہ مسائل جو حالات کے طعن سے آج پیدا ہو رہے ہیں، ان میں غور و فکر اور تحقیق و اجتہاد کا سلسلہ تو بہر حال برقرار رہے گا، لیکن چوں کہ آج دین کی کامل بصیرت اور نصوص پر گہری نظر رکھنے والے لوگ عنقا ہیں اس لیے یہ کام انفرادی کی بجائے اجتماعی سطح پر ہو رہا ہے۔ دنیا بھر میں جو فقہی اکیڈمیاں ہیں وہ یہ کام بخوبی کر رہی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریقہ انفرادی طریقہ سے زیادہ بہتر ہے۔

رہی اجتہاد کے مختلف درجات کی بات تو اس کے لیے آپ کو سب سے پہلے مجتہد مطلق اور مقلد مطلق کو سمجھنا ہوگا۔ جو کتاب و سنت کو سامنے رکھ کر اصول بناتا ہے اور مسائل کا استخراج و استنباط کرتا ہے، وہ کسی اور عالم کی پیروی نہیں کرتا۔ مجتہد مطلق کی مثال اربعہ ہیں، وہ اصول و فروع کسی میں بھی کسی دوسرے کی پیروی نہیں کرتے۔ مقلد مطلق وہ ہے جس کو شریعت کا کچھ بھی علم نہیں۔ اس نے اہل علم سے مسئلہ سنا اور اس پر آنکھ بند کر کے عمل کر رہا ہے، یہ مسئلہ کیسے ثابت ہوا اور کون سی دلیل ہے اس کے لیے نہ تو وہ جانتا ہے اور نہ جاننے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ ان دونوں طبقات کے بیچ میں بھی کئی طبقات ہیں جو بعض مسائل میں تو خود اپنی رائے رکھتے ہیں، مگر بعض دوسرے میں وہ امام اعظم کی تقلید کرتے

پنجم: اصحاب ترجیح جیسے ابوالحسن قدوری اور صاحب ہدایہ، ان کا کام بعض روایات کو بعض دیگر روایات پر ترجیح دینا ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ اس طرح کے الفاظ لاتے ہیں: هذا أولى، هذا اصح رواية، هذا أوضح، هذا أوفق للقياس، هذا أرق للناس۔ ششم: اصحاب تمیز، یہ اتنی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اقویٰ، قوی، ضعیف، ظاہر الروایہ، ظاہر المذہب اور روایت نادرہ میں امتیاز کر لیں۔ جیسے صاحب کنز الدقائق، صاحب مختار، صاحب وقایہ وغیرہم مصنفین متون معتبرہ، ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنی کتابوں میں نا مقبول اقوال اور ضعیف روایات نقل نہ کریں۔

ہفتم: مقلدین، جو تمیز کی بھی قدرت نہیں رکھتے اور جو پاگئے حاطب اللیل کی طرح کتاب میں جمع کر دیتے ہیں، فالویل لمن قلدهم کل الویل۔ آٹمی: ہو سکتا ہے کئی نہیں تو جزوی اصحاب تمیز آج بھی موجود ہوں، اور آئندہ بھی ہوتے رہیں۔ مولانا عبد الوہاب خلی: علمائے فقہ و اصول نے مجتہدین کے متعدد طبقات ذکر کیے ہیں۔ کوئی مجتہد فی المذہب ہوتا ہے، کوئی مجتہد منتسب (اصولی طور پر کسی مجتہد سے متفق اور فروع میں کلی طور پر متفق نہ ہو) اور کوئی مجتہد مطلق ہوتا ہے۔ الحمد للہ ”کل يعمل علی شاکلته“ کے تحت مجتہدین کا ہر طبقہ کہیں نہ کہیں پایا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کل مجتہدین اور فقہاء کا سیلاب اُٹھ آیا ہے اور شیخ الاسلام اور فقیہ العصر کے بھاری بھر کم القاب سے ملقب حضرات کی بہتات نظر آتی ہے۔ واللہ المستعان۔

مولانا وحید الدین خاں: فقہا نے مجتہدین کے کئی طبقے بنائے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ غیر ضروری تطویل ہے، حقیقی معنوں میں مجتہدین کی دو قسمیں ہیں: (۱) جزئی مجتہد اور (۲) کلی مجتہد، مثلاً طبی انجکشن کا طریقہ قدیم زمانے میں موجود نہ تھا، اب جو شخص انجکشن کے معاملے میں اجتہاد کر کے اس کا شرعی حکم بتائے، وہ جزئی مجتہد ہے، اسی طرح سیکولرزم قدیم زمانے میں موجود نہیں تھا۔ اب سیکولرزم پر اجتہاد کر کے جو اس کا شرعی حکم بتائے وہ کلی مجتہد ہے۔

مولانا عبد الحمید نعمانی: اجتہاد دراصل نو پیدا غیر منصوص مسائل کو کتاب و سنت کے

ہیں۔ بعد کے ادوار میں امام طحاوی، ابن ہمام وغیرہ خود مجتہد ہیں، لیکن وہ اصول میں امام اعظم کی اور مسائل میں امام محمد اور امام ابو یوسف کی پیروی کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اہل علم کو بھی اپنے سے زیادہ علم رکھنے والے کا اتباع کرنا پڑتا ہے۔ اسی سے اجتہاد کے اور مجتہدین کے مختلف طبقات سامنے آتے ہیں۔

سوال (۳): - امام اعظم ابو حنیفہ اور دوسرے تینوں کا اصل علمی کارنامہ کیا ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ پوری امت انہی چاروں کی تقلید پر متفق ہو گئی؟

مولانا محمد احمد مصباحی: - عہد رسالت اور عہد صحابہ میں لوگ قرآن و سنت کی عام ہدایات اور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طرز عمل کو سامنے رکھتے ہوئے کار بند تھے۔ خلوت و جلوت میں خوف خدا، عدل، امانت، عام نصیحت و خیر خواہی، دعوت خیر، منع شر، کار خیر میں تعاون، کار شر سے کنارہ کشی وغیرہ عام اصول تھے جس پر ہدایت قرآنی مشتمل تھی، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی فضائل و محاسن پر صحابہ کرام کی تربیت فرمائی، جزئی امور میں صحابہ کرام کو اگر کوئی اشکال پیش آتا تو سرکار کی بارگاہ میں رجوع کرتے یا اکابر صحابہ سے معلوم کرتے، تمدن کی وسعت اور اسلامی رقبہ کے پھیلاؤ کے بعد واقعات و معاملات کی بے پناہ کثرت ہوتی گئی اور افراد بھی اچھے برے، حق کوش، ناحق کوش، عدل پرور، ظلم شیوہ ہر طرح کے پیدا ہونے لگے، ایسے ماحول میں اقامت خیر اور دفع شر کے لیے مبسوط اصول و قوانین اور مفصل جزئیات مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ ان قوانین کی روشنی میں افراد اپنے معاملات کی صحت و سقم کو سمجھ سکیں اور جہاں حکومت کی مداخلت کی ضرورت ہو وہاں حکومت ان قوانین کے تحت رعایا کے معاملات حل کر سکے۔

اس طرف باضابطہ اور ہمہ گیر توجہ سب سے پہلے امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مبذول فرمائی اور ایک فقہی مجلس کی شکل میں اپنے تلامذہ کو جمع کر کے مسلسل جدوجہد کی، اسی روش پر دیگر ا بھی چلے اور اصول فقہ اور فقہ کی شکل میں دو مستقل فن وجود میں آئے، ان سب پر مفصل گفتگو اور مستقل تبصرہ کا موقع نہیں، مگر چند باتوں کی جانب اشارہ ہو سکتا ہے، مثلاً

(۱) ان حضرات نے کتاب و سنت اور آثار صحابہ میں نظر کر کے یہ واضح فرمایا کہ احکام

کی مشروعیت کا ہدف پانچ چیزوں (نفس، دین، عقل، مال، نسب) کا تحفظ ہے۔ اور سارے احکام اسی امور پر گردش کرتے ہیں۔

(۲) طلب اور ممانعت کے مدارج و مقاصد اور دلالت کے احوال و مراتب پر غور کیا، یعنی کس چیز کا مطالبہ لازمی طور پر اور شدت کے ساتھ ہے، پھر اس مطالبہ سے کون سا اہم امر مقصود ہے، جس آیت سے یہ مطالبہ مفہوم ہو رہا ہے، اس کی دلالت، اس پر بہت واضح اور نمایاں ہے یا دقیق اور مبہم یا محتمل ہے، بلفظ دیگر قطعی و جزئی ہے یا ظنی و احتمالی؟ اگر حدیث سے کسی فعل کا مطالبہ سمجھ میں آ رہا ہے تو خود اس حدیث کا ثبوت کس درجہ کا ہے۔ وہ حدیث متواتر ہے یا مشہور یا آحاد ہے؟ صحیح ہے یا حسن یا ضعیف وغیرہ؟ پھر طلب واضح ہے یا مبہم؟ ان امور پر نظر کے نتیجے میں احکام کے بھی درجات و اقسام طے ہوئے۔ مثلاً فرض، واجب، سنت مؤکدہ، سنت غیر مؤکدہ، مستحب، حرام، مکروہ تحریمی، اساءت، مکروہ تنزیہی، خلاف اولیٰ، مباح۔

(۳) اصول و قواعد کی تائیس کے بعد جزئیات کی تفریع و تدوین کا مرحلہ آتا ہے، اس سلسلے میں فقہائے امت کی جانکاہی و عرق ریزی جاننے کے لیے فقہ کی کوئی کتاب اٹھا کر اس کی فہرست پر نظر ڈالیں آپ کو معلوم ہوگا کہ طہارت اور عبادات سے لے کر نکاح و معاملات، وقف، میراث، حدود و تعزیرات وغیرہ تمام ابواب سے متعلق احکام کا ذخیرہ نہایت خوش اسلوبی سے مرتب کر دیا گیا ہے، دنیا کے بڑے بڑے ماہرین قانون بھی ایسے جامع اور مستند مجموعے پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

۱ اربعہ کے مذاہب پر اتفاق امت کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہر باب کے احکام مدون کر دیے اور بعد کے اہل نظر متبعین حالات کے مطابق ان کی تنقیح اور ان میں اضافہ کرتے رہے۔ عام آدمی جو خود اجتہاد و استنباط کی صلاحیت نہیں رکھتا، شرعی زندگی گزارنے کے لیے کوئی ایسا ہی مذہب اپنا سکتا ہے، جس میں ضرورت کے تمام مسائل مدون اور مرتب شکل میں موجود ہوں، امام اوزاعی، امام لیث بن سعد، امام ابن جریر طبری وغیرہم کے مذاہب مدون اور محفوظ و منقول نہ ہوئے، اس لیے امت انہیں اپنانے بلکہ جاننے سے بھی قاصر رہی۔

مولانا عبدالوہاب خلیجی: - امام ابو حنیفہ اور دیگر ثلاثہ وغیرہم رحمہم اللہ مجتہدین امت

ساتھ یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ قرآن کے جوا حکامات ہیں، جو احادیث ہیں، جو صحابہ کے معمولات ہیں، وہ سب کے سب انہی چاروں میں موجود ہیں، کوئی حکم یا عمل ان سے الگ نہیں مل سکتا، اس لیے وہ حضرات بھی جو اجتہاد کا دعویٰ کرتے ہوئے آج تقلید کا انکار کرتے ہیں وہ جو کچھ بھی اجتہاد کرتے ہیں، ان کا وہ اجتہاد اربعہ میں سے کسی کے یہاں ضرور موجود ہوتا ہے تو شرعی مسائل میں اختلافات توسع کے لیے ہیں اور یہ توسع اربعہ کی تقلید سے حاصل ہو جاتا ہے، اب ہمیں کسی بھی قول یا عمل پر عمل کرنے کے لیے الگ جانے کی ضرورت نہیں، اربعہ کے یہاں سب کچھ موجود ہے۔ زور سے آمین کہنے کا مسئلہ ہو، یا قرأت خلف الامام کا مسئلہ ہو، ان مسائل میں آج کچھ لوگ اختلاف کرتے ہیں اور اجتہاد کرتے ہیں، حالاں کہ وہ جو تحقیق بھی لے کر آتے ہیں وہ کسی نہ کسی امام کے یہاں موجود ہے، ان کا اجتہاد کوئی الگ سے نہیں ہوتا۔

اب کچھ لوگ آج یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ انہی چاروں میں سے کسی ایک کی تقلید کرو؟ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے ہمیں ان میں سے کسی ایک کی تقلید کا حکم نہیں دیا۔ لیکن بعد میں جو حالات سامنے آئے یہ حالات وجوب پر دلالت کرتے ہیں۔ یعنی صورت حال ایسی ہی ہے کہ انہیں میں سے کسی ایک کا اتباع کرنا آپ کی مجبوری ہے۔ آپ نہ تو بیک وقت ان چاروں کی پیروی کر سکتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں ہے اور نہ ان سے ہٹ کر کسی اور کی تقلید کر سکتے ہیں کہ یہ بھی ممکن نہیں ہے، کیوں کہ ان سے ہٹ کر کوئی اجتہاد سامنے آ ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے علما نے کہا ہے کہ ”حالات“ کے پیش نظر ان چاروں میں سے کسی ایک کی پیروی واجب ہے اور اس سے انکار سخت گمراہی ہے، رہا یہ کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور صاحب فتح القدیر وغیرہ نے بعض مسائل میں اختلاف کیا ہے، یہ ان کے تفردات ہیں اور تفردات بھی ایسے کہ وہ کسی نہ کسی امام متبوع کے یہاں ضرور موجود ہیں، اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ امت کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہوگی، اس لیے امت کا جو عمل ہے وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے امام ترمذی وغیرہ نے کہا کہ عمل امت سے ضعیف حدیث صحیح کی منزل میں آ جاتی ہے اور اسی وجہ سے صحیح

ہیں اور ان کی کوششیں قابل ستائش، لائق استفادہ اور ان شاء اللہ باعث اجر و ثواب ہیں، لیکن ان میں سے کسی کے لیے عصمت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ امام دارالبحر ت امام مالک بن انس رحمہ اللہ کا مشہور قول ہے ”کل منا مأخوذ منه ومردود علیہ الا صاحب هذا القبر“ (یہ قول اصلاً مجاہد اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے) یعنی نبی ﷺ کے علاوہ کوئی شخص ایسا نہیں جس کی بات لی اور چھوڑی نہ جاسکتی ہو۔ لہذا امت کے کسی امام و فقیہ کے ہر قول و فتویٰ کو لائق اتباع سمجھنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے، بلکہ مخالف دلیل صحیح اور نص صریح قول و عمل کا ترک کرنا واجب ہے اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس پر علمائے امت کا اجماع نقل کیا ہے۔ اربعہ کی تقلید پر کبھی کسی دور میں اجماع منعقد نہیں ہوا۔ خود اربعہ رحمہم اللہ نے اپنے متبعین اور تلامذہ کو سختی سے کتاب اللہ اور صحیح سنت مصطفیٰ ﷺ پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے۔ بھلا ایک غلط چیز یعنی جامد تقلید پر امت کے علما مجتہدین کیوں کمر متفق ہو سکتے ہیں۔ (بعض فقہاء اجماع کا دعویٰ اپنے مخالف کو مرعوب کرنے کے لیے بطور ہتھکنڈہ استعمال کرتے ہیں جب کہ تحقیق کے بعد اختلافی مسائل خلاfiہ میں ایسے مزعومہ اجماعات کی پول کھل جاتی ہے۔ لہذا اجماع کا دعویٰ کرنے میں کمال احتیاط سے کام لینا چاہیے)

مولانا وحید الدین خاں:- میرے نزدیک فقہاء میں کوئی نہ امام اعظم ہے اور نہ کوئی امام اصغر، سارے فقہا برابر ہیں۔ میرے نزدیک انہی چاروں کی تقلید پر اتفاق کر لینا درست نہیں۔ کیوں کہ چاروں فقہا نے اپنے زمانے کے لحاظ سے فقہی خدمت انجام دی۔ نئے دور میں نئے فقہا مطلوب ہیں، جو دوبارہ حالات کے لحاظ سے فقہی خدمت انجام دیں۔

مولانا عبدالحمید نعمانی:- ابھی میں نے کہا کہ قرآن میں جو باتیں صراحت کے ساتھ نہیں ہوتی ہیں ان میں اجتہاد کیا جاتا ہے، بلاشبہ اربعہ کے علاوہ بھی کئی ایک مجتہد پیدا ہوئے اور انہوں نے اجتہاد کیا۔ لیکن جن حضرات کی اجتہادی کاوشیں مدون شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں، وہ یہی چاروں ہیں۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل۔ اس لیے امت کی مجبوری ہے کہ وہ انہی میں سے کسی ایک کی تقلید کرے، کسی اور امام کے اجتہادات مدون ہی نہیں ہیں تو ان کی تقلید کیوں کر ممکن ہے؟ اس کے

معاملے میں میری رائے وہی ہے جو ابن رجب حنبلی کی رائے ہے۔

مولانا عبدالحمید نعمانی:- وہ اسی لیے کہ اجتہاد خصوصی ذہن اور عمل کا نام ہے اور یہ سب کے بس کی چیز نہیں ہے، چاہے وہ محدث ہو، مفسر ہو یا اور کوئی۔ میں نے کہا کہ امت میں ہمیشہ دو ہی طبقے رہے ہیں، ایک وہ جو بات مانتا ہے اور دوسرا وہ جس کی بات مانی جاتی ہے، جس کی بات مانی جائے گی وہ مجتہد ہوگا اور جو بات مان رہا ہے وہ مقلد ہے۔ سمجھ بوجھ اس کے اندر بھی موجود ہے لیکن اس درجے کی نہیں کہ وہ خود اجتہاد کر سکے۔ اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ کتب احادیث پڑھنے کے دوران یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ یہ لوگ کس کے مقلد تھے، امام مسلم کس کی تقلید کرتے تھے، فقہی امور میں امام نسائی کس کا اتباع کرتے تھے۔ اہل علم میں اس تعلق سے اختلاف بھی ہوتا ہے۔ کچھ حضرات انہیں شافعی بتاتے ہیں، کچھ حنفی بتاتے ہیں، کچھ حنبلی بتاتے ہیں تو یہ بحث کیوں ہے؟ اسی لیے کہ یہ حضرات محدث ہونے کی حیثیت سے معروف ہیں۔ انہوں نے احادیث کی تلاش و جستجو کی، تحقیق کی، دوسروں سے حد سنیں اور خود انہیں بیان کیا، ان کا مشغلہ یہی تھا، انہوں نے احادیث سے مسائل کے استنباط و استخراج کا عمل نہیں کیا۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ بعض محدث نے اجتہاد بھی کیا، لیکن ان کا اجتہاد باضابطہ نہیں ہے اور نہ وہ مدون ہے۔ مثلاً میں اگر سوال کروں کہ تراویح کے بارے میں امام بخاری کا کیا مسلک ہے؟ وہ بیس پڑھتے تھے یا آٹھ پڑھتے تھے یا بارہ پڑھتے تھے؟ تین طلاق کے بارے میں ان کا کیا نظریہ تھا؟ یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ انور کی زیارت کو جانا کیسا ہے؟ اس طرح کے سینکڑوں مسائل ہیں، جن کے تعلق سے اگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک دریافت کیا جائے تو اس کا جواب نہیں مل سکتا۔

آپ کا سوال محدث اور مفسرین کے طبقے سے ہے اور ان کے حوالے سے ہاں اور نہیں میں جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیے کہ محدث ہونا، مفسر ہونا ایک خاص وصف ہے، ہو سکتا ہے کہ محدث یا مفسر ہونے کے ساتھ کوئی مجتہد بھی ہو، یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مجتہد نہ ہو مقلد ہو، تو مجتہد یا مقلد ہونے کا سوال اگر کسی فرد کے تعلق سے کیا جائے تب تو صحیح ہے لیکن طبقات کے تعلق سے اگر کیا جائے تو ہاں یا نا میں اس کا جواب نہیں مل سکتا۔ بہت سے

حدیث کے مقابل اگر ضعیف حدیث معمول بہ ہے تو وہ زیادہ لائق اتباع ہے، سنت کہتے ہی اسی کو ہیں جو معمول ہو، مثال کے طور پر بخاری شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرتے تھے اور اپنی زوجہ کو بوسہ لیتے تھے، یا جوتا پہن کر نماز پڑھتے تھے، تو یہ چیزیں اگرچہ حدیث صحیح سے ثابت ہیں لیکن چوں کہ ان پر عمل نہیں رہا، اس لیے یہ سنت نہیں ہیں، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی حالت میں ان کے نواسے ان پر چڑھ جاتے تھے، یہ حدیث موجود ہے، لیکن یہ امت میں معمول اور جاری نہیں ہوا، اس لیے اس حدیث کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی نواسہ تلاش کرنے جائے اور نماز کی حالت میں اپنے اوپر سوار کر لے۔ تو خلاصہ یہ کہ حدیث صحیح کا موجود ہونا ہی کافی نہیں ہے، ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ اس کے تعلق سے صحابہ کا عمل کیسا رہا، تابعین کا عمل کیسا رہا، تبع تابعین کا عمل کیسا رہا وغیرہ۔

سوال (۴):- کیا حضرات محدث و مفسرین بھی مقلد تھے؟ اگر ہاں تو کیوں؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- محدث و مفسرین سے مراد صحاح ستہ وغیرہ کے مصنفین اور مشہور کتب تفسیر کے مرتبین ہیں تو بلاشبہ وہ مقلد تھے، جس کی وجہ یہ ہے کہ استخراج احکام کے لیے صرف حفظ حدیث کافی نہیں اور بھی بہت سے لوازم ہیں، جن کے بغیر کاراجتہاد کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ ان لوازم کا فقدان ان خدا ترس حضرات کے لیے اجتہاد سے مانع اور تقلید کا باعث ہوا۔

مولانا عبدالوہاب خلیجی:- بعض محدث و مفسرین اصولی طور پر اربعہ کی طرف انتساب کرتے تھے، لیکن فروعات میں ان کے پابند نہ تھے، جیسا کہ آج کل کے اکثر متنبین مذاہب علماء کا وطیرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اربعہ کے بعض اجلہ تلامذہ نے ایک تہائی سے دو تہائی تک مسائل فرعیہ کے اندر اپنے اساتذہ کا ساتھ نہیں دیا۔ لہذا اگر مقصود اصلی اتباع دلیل ہو تو میرے خیال میں انتساب اگر مستحسن امر نہیں تو حرام و مکروہ بھی نہیں ہے، بلکہ جواز اور مباح کے دائرہ میں آتا ہے۔

مولانا وحید الدین خاں:- مفسرین کا لفظ میرے نزدیک اس بحث میں مبہم ہے۔ کیوں کہ مفسرین چودہ سو سال تک پھیلے ہوئے ہیں۔ البتہ طبقہ اول کے محدث کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے، میرے مطالعے کے مطابق محدث کا کوئی فقہی مسلک نہ تھا۔ اس

محمد اور مفسرین مقلد تھے اور بعض مجتہد تھے، لیکن اربعہ جو محدث و مفسر بھی تھے، کے علاوہ کسی اور کی فقہ باضابطہ مدون نہ ہو سکی۔

سوال (۵): - اس الزام کی کیا حقیقت ہے کہ تقلید نے علم و تحقیق کے دروازے بند کر دیے؟ اگر یہ سچ ہے تو پھر ان عبقری علمائے مقلدین کی علمی خدمات کو کیا نام دیں گے جن پر آج بجا طور پر امت کو فخر کرنے کا حق ہے؟

مولانا محمد امجد مصباحی: - اولاً ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ تقلید نے علم و تحقیق کے دروازے بند کر دیے۔ تحقیق کا عمل برابر جاری ہے اور جیسا کہ آپ نے اشارہ کیا فقہائے مقلدین کی حیرت انگیز علمی و تحقیقی خدمات اس پر شاہد عدل ہیں اور اگر یہ کہیں کہ تقلید نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا تو یہ بھی ہمیں تسلیم نہیں۔ جو شخص اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہے، اس کے لیے تقلید جائز نہیں، اسی لیے اکرام نے اجتہادی صلاحیت رکھنے والے اپنے تلامذہ سے یہ فرمایا کہ ”ہم نے جس مأخذ سے احکام اخذ کیے ہیں، اسی سے تم بھی اخذ کرو“

یاد فرمایا کہ ”ہمارے بیان کردہ احکام پر تمہارے لیے عمل جائز نہیں، جب تک یہ نہ جان لو کہ ہم نے یہ احکام کہاں سے اخذ کیے“۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے ارشادات کے مخاطب کو فو بغداد اور مدینہ و مصر کے وہ دوکاندار اور کاشت کار یا صنعت کار نہیں جو کتاب و سنت اور اخبار و آثار کی تصریحات، اشارات، دلالات اور اقتضات سے نا بلد اور اپنے کاروبار میں مصروف ہیں، وہ فوجی اور ملازمت پیشہ بھی نہیں جو تلاوت و قرأت سے زیادہ کی صلاحیت نہیں رکھتے، اہل اجتہاد کے لیے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے اور نا اہل کے لیے شروع ہی سے بند ہے۔

ثانیاً اگر کوئی طبقہ یہ چاہتا ہے کہ اہلیت اجتہاد ہو یا نہ ہو اجتہاد کا دروازہ ہر شخص کے لیے چو پٹ کھلا رہنا چاہیے تو بہت صفائی کے ساتھ عرض ہے کہ جو دروازہ صرف اہل حضرات کے داخلے کے لیے کھلا اگر اس سے صرف نا اہلوں کی آمد و رفت ہونے لگے تو اسے سختی کے ساتھ بند کر دینا ہی عقل و دانش اور ایمان و حکمت ہر ایک کا تقاضا ہے، اسی میں متاع گراں مایہ کی حفاظت ہے اور خلاف ورزی میں کھلی ہوئی بربادی۔

تجربہ شاہد ہے کہ آج اہلیت اجتہاد تو درکنار ارشادات ا کے مصادر و مأخذ سے

کامل آشنائی بھی مفقود ہے، اہلیت کے بغیر منصب اجتہاد پر تمکن کا شوق اور اس کی جسارت ناروا ایسے ہی دلوں میں ہوتی ہے جو خوف الہی سے عاری ہوں۔

مولانا عبد الوہاب خلیجی: - یقیناً تقلید جامد نے علم و تحقیق کے دروازے بند کر دیے، کیونکہ جب آدمی کسی ایک امام کے تمام اقوال کو ہی دین سمجھنے لگتا ہے اور اسی کی پیروی کو اپنے لیے باعث نجات سمجھتا ہے اور دیگر ا کے اقوال اور ادلہ پر نظر نہیں کرتا یا ان کے درمیان جمع و تطبیق اور ترجیح کی صورتوں کو بروئے کار نہیں لاتا تو بلاشبہ علم و تحقیق اور اجتہاد و ترجیح کی راہ بند ہو جاتی ہے اور اگر حضرات مقلدین تقلید کے بجائے تحقیق و اتباع کی راہ اختیار کرتے تو اصحاب مذاہب اکرام کی خدمات علمیہ و فہمیہ کو مزید فروغ حاصل ہوتا اور ان سے استفادہ بھی عام ہوتا اور جو لوگ مذاہب اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں وہ مسلمانوں کے تقلیدی فقہی مذاہب اور ان کے فکری و علمی جمود اور آپسی اختلاف و انتشار کے باعث تردد کا شکار ہو کر دولت اسلام سے محروم نہ ہوتے۔ لہذا علمائے امت کی خدمات جلیلہ سے استفادہ کرتے ہوئے ہمیں ادلہ صحیحہ اور نصوص شرعیہ کی پیروی کرنی چاہیے اور ”اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونه اولیاء“ (الاعراف: ۳) تم لوگ اس کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس آئی ہے اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے رفیقوں کا اتباع نہ کرو۔ اور ”اتخذوا أحبارہم و رہبانہم ارباباً من دون اللہ“ (التوبہ: ۳۱) ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنالیا ہے کی تفسیر ماثور جو عدی بن حاتم سے بسند صحیح مسند احمد و سنن ترمذی میں منقول ہے، اگر سامنے رکھی جائے تو تقلید جامد کی قباح و شاعت کھل کر سامنے آجائے گی اور امت تقلید پر فخر کرنے کے بجائے شرم و ندامت کے آنسو بہائے گی۔

مولانا وحید الدین خاں: - میرے نزدیک یہ الزام نہیں بلکہ ایک درست بات ہے۔ تقلید ہمیشہ تخلیقی فکر کا دروازہ بند کرتی ہے اور مسلمانوں میں ایسے ہی ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہزار سال کی مسلم تاریخ میں صرف ایک تخلیقی مفکر پیدا ہوا۔ اور وہ تھے علامہ ابن خلدون۔

مولانا عبد الحمید نعمانی: - یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ تقلید نے علم و تحقیق کے دروازے بند کر دیے ہیں وہ مسائل کا صحیح شعور نہیں رکھتے۔ ان کو پتا ہی نہیں کہ تقلید کیا چیز ہے، مجتہد امام کی

رکھنے والا کون مبتدع پیدا ہوا ہے؟ حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں، میں اپنے گھر واپس آیا فاقبلت علی کتب ابی حنیفہ امام ابوحنیفہ کی کتابیں دیکھنی شروع کیں (اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی لکھی ہوئی کتابیں ان کے پاس موجود تھیں) ان سے کچھ مسائل منتخب کر کے لکھے اور سرخی یہ ڈالی: قال النعمان بن ثابت، پھر امام اوزاعی کے پاس گیا، مجھ سے وہ اوراق انہوں نے لے لیے اور مطالعہ کے بعد پوچھا یہ نعمان بن ثابت کون ہیں؟ ابن مبارک نے کہا ایک شیخ ہیں، جن سے عراق میں میری ملاقات ہوئی، فرمایا: هذا نبیل من المشائخ، ابن مبارک نے بتایا یہ وہی ابوحنیفہ ہیں، جن کا آپ نے ذکر کیا تھا۔ بعد میں امام اوزاعی کی ملاقات امام ابوحنیفہ سے مکہ میں ہوئی اور عبداللہ بن مبارک کے پیش کردہ مسائل اور دیگر مسائل پر گفتگو کے بعد انہوں نے امام اعظم کے تبحر علمی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے قول سے استغفار کیا اور عبداللہ بن مبارک سے فرمایا: ابوحنیفہ کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا گیا تھا، میں نے انہیں اس کے برخلاف پایا، تم ان کی بارگاہ فیض سے وابستہ رہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عصر ہی میں وہ حاسدین کی عداوتوں اور غلط پروپیگنڈوں کا نشانہ تھے۔

مگر اس تاریخی حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ ابوحنیفہ وہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے استنباط کے اصول و قواعد وضع کیے اور فقہی احکام کی تدوین کی۔ دیگر ان سے استفادہ کیا، امام ابن حجر ہیتمی شافعی نے الخیرات الحسان میں یزید بن ہارون کی روایت لکھی ہے کہ امام سفیان ثوری نے کسی حیلے سے امام ابوحنیفہ کی کتاب الرہن کی نقل حاصل کی اور اس سے استفادہ کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظم کی ایک تصنیف کتاب الرہن بھی تھی۔

بالفرض امام اعظم نے خود کوئی کتاب نہ لکھی، یا لکھی اور ناپید ہو گئی، ان کا مذہب ان کے تلامذہ نے قلم بند کیا یا ثقافت نے زبانی طور پر اس کی روایت کی تو اس سے امام اعظم کی فقہی خدمات اور علمی جلالت پر حرف نہیں آتا۔ اجلہ صحابہ میں سے حضرت علی، حضرت عبد اللہ ابن مسعود، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی کوئی کتاب نہ آج دستیاب ہے نہ پہلے کسی زمانے میں تھی، لیکن تفسیر وحدیث اور فقہ میں ان حضرات کی عظمت شان سے کسی

رہنمائی میں صحیح جگہ پہنچنا تقلید کہلاتا ہے۔ تقلید کا مطلب نہ تو آوارگی ہے اور نہ ایسی غلامی ہے کہ آدمی سو فیصد اندھا ہو جائے۔ بلکہ امام سے حسن ظن رکھتے ہوئے شریعت کا جو منشا ہے، جو مطلوب ہے اسی کی پیروی کرنے کا نام تقلید ہے۔ تقلید اور اتباع میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور اتباع کرنا اپنے سے بڑے کا یہ فطرت ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ تقلید نے لوگوں کو اندھا کر دیا ہے یا غلام بنا دیا ہے، تقلید کے مفہوم سے ناواقفی کا نتیجہ ہے، اگر تقلید کا مطلب آنکھ بند کر کے دوسروں کی پیروی لے لیا جائے تو پھر سوال ہوگا کہ مقلدین نے اتنے سارے علمی و تحقیقی کام کیوں کیے؟ آپ نظر اٹھا کر دیکھ لیجیے کل سے آج تک سارے بڑے بڑے علمی و تحقیقی کارنامے انہوں نے انجام دیے جو خود مقلد تھے۔ ان کے علاوہ کسی نے نہیں کیا۔ حدیث کی خدمت ہو، فقہ کی ہو، قرآن کی ہو، سب انہی لوگوں نے کی ہے، حدیث، تفسیر، فقہ کسی بھی فن میں علماء کے طبقات آپ دیکھ لیجیے، طبقات حنفیہ، طبقات شافعیہ، طبقات مالکیہ، طبقات حنبلیہ تو ملیں گے، لیکن کہیں بھی آپ کو طبقات غیر مقلدین نام کی کتاب نہیں مل سکتی تو اہل علم و مجتہدین کے طبقات یہی چاروں ہیں، کوئی پانچواں طبقہ موجود نہیں ہے۔ آج جو لوگ ان چاروں سے ہٹ کر راہ نکالنے کی کوشش میں ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی روش بھی کمتر لوگوں کی تشددانہ تقلید ہی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جو لوگ اربعہ کی تقلید کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں وہ کہیں، اس سے زیادہ شدت سے امام ابن تیمیہ کی تقلید کرتے ہیں اور ابن قیم کی تقلید کرتے ہیں تو جو لوگ آج مقلد کہلانے کی بجائے اپنے کو اہل حدیث کہہ رہے ہیں وہ بھی اپنے بڑوں کی تقلید ہی کر رہے ہیں۔

سوال (۶): امام اعظم ابوحنیفہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے شرعی احکام کی تخریج و استنباط کے لیے اصول وضع کیے، دوسرے مجتہدین بھی کسی نہ کسی طور سے ان کے فیض یافتہ ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ غیر مقلدین حضرات سب سے زیادہ انہیں کے خلاف صف آرا رہتے ہیں؟

مولانا محمد احمد مصباحی: امام اعظم سے عداوت کوئی نئی چیز نہیں خود ان کے زمانے کا واقعہ ہے، جسے خطیب نے بھی بیان کیا ہے کہ امام اوزاعی سے بیروت میں حضرت عبداللہ بن مبارک شاگرد امام ابوحنیفہ کی ملاقات ہوئی، انہوں نے پوچھا یہ کوفہ میں ابوحنیفہ کنیت

باخبر منصف مزاج کو انکار نہیں۔ آخر امام شافعی نے سارے لوگوں کو امام ابوحنیفہ کی عیال کیوں بتایا؟ خود اپنی یا اپنے استاذ امام محمد یا امام مالک رحمہم اللہ کی عیال نہیں بتایا؟ کیا امام شافعی بھی امام ابوحنیفہ کی تقلید جامد یا اندھی عقیدت میں مبتلا تھے؟

میں سمجھتا ہوں کہ اہل انصاف جس امر کو امام اعظم کی اولیت اور عظمت شان کی دلیل سمجھتے ہیں، وہی اہل عناد کی عداوت و مخالفت کی بنیاد ہے، امام اعظم نے آزادانہ اجتہاد سے کام نہ لیا۔ بلکہ پہلے اجتہاد کے اصول و ضوابط مقرر کیے، دلائل کے مراتب اور ان کی حیثیتوں کا تعین کیا، پھر دلائل اور قواعد کی روشنی میں فروع و احکام کی تخریج فرمائی، دیگر اعدالین رحمہم اللہ نے بھی اس عادلانہ روش کی پیروی کی۔ مگر آج جب کسی کے سر میں آزادانہ اجتہاد یا ہوائے نفس کے مطابق انتخاب احکام کا سودا سماتا ہے تو یہ اصول و ضوابط اس کی آزادی طبع اور غلط روی کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے دل کا بخار اسی پر اترتا ہے جس نے اس طریقے کی بنا ڈالی۔

امام اعظم کے خلاف علم حدیث میں کم مائیگی کا پروپیگنڈا بھی کوئی نیا نہیں، مگر امام ابو یوسف جو امام اعظم کے شاگرد اور ان کی مجلس فقہ کے رکن تھے، علم حدیث میں ان کے تبحر اور مہارت کا اعتراف بڑے بڑے ائمہ نے کیا ہے، جس کے باعث اعدائے زمانہ کے لیے بھی مجال انکار نہیں، یہ امام ابو یوسف بیان کرتے ہیں کہ بعض اوقات امام ابوحنیفہ سے میرا اختلاف ہوتا اور کوئی فیصلہ نہ ہو پاتا، پھر میں محد کو فہ کے یہاں جاتا کہ میرے یا میرے شیخ کے قول کی تائید میں کوئی حدیث مل جائے، جس کے ذریعہ اختلاف کا تصفیہ ہو۔

مجھے امام کے قول کی تائید میں ایک دو حد مل جاتیں، میں آکر امام کو سنا تا وہ قبول نہ کرتے، میں عرض کرتا یہ تو آپ کے قول کے موافق ہے، اسے آپ کیوں نہیں لیتے؟ وہ فرماتے اس میں فلاں فلاں علت قادحہ ہے۔ اہل کوفہ کا علم حدیث مجھ سے مخفی نہیں، غور کیجیے جس شیخ کی نظر اتنے جلیل القدر حدیث سے فزوں تر ہو، خود اس کی حدیث دانی کا پایہ کتنا بلند ہوگا؟ مگر تعصب و عناد کی بیماری کا کوئی علاج نہیں۔

محدث کا کام سونا جمع کرنا ہے اور ناقد کا کام پرکھ کر بتانا کہ کون سونا کتنا کھرا ہے کتنا

کھوٹا؟ اسی طرح محدث کا کام شفا بخش دواؤں کا ذخیرہ کرنا ہے اور فقیہ کا کام امراض اور مریضوں کی تشخیص کے ساتھ ان دواؤں کا استعمال کرنا ہے، امام اعظم کے استاذ امام اعظم سے کچھ مسائل دریافت کیے گئے وہ نہ بتا سکے۔ امام ابوحنیفہ سے پوچھا انہوں نے بتا دیا۔ استاذ نے پوچھا تم نے یہ جوابات کہاں سے اخذ کیے؟ عرض کیا فلاں فلاں حدیثوں سے، جو آپ نے اس اس سند سے مجھ سے بیان فرمائیں۔ فرمایا اے فقہا تم لوگ طبیب ہو اور ہم محد عطار ہیں اور ابوحنیفہ تم تو دونوں ہو۔ میں نے سودن میں جو حد تم سے بیان کیں وہ ایک ساعت میں تم مجھے سنائے دے رہے ہو۔

دونوں واقعے الخیرات الحسان لابن حجر المہتمی الشافعی میں ہیں۔

پھر فقہ و اجتہاد کا کمال علم حدیث میں رسوخ کے بغیر متصور بھی نہیں، حدیث کے تمام مراحل اور شعبوں کو عبور کیے بغیر پایہ اجتہاد تک رسائی ناممکن ہے۔

مولانا عبدالوہاب غلجی:- امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی جانب کسی کتاب کی نسبت خواہ وہ اصول میں لکھی گئی ہو یا فروع میں صحیح نہیں ہے۔ فقہ حنفی کا سارا ذخیرہ امام محمد بن حسن شیبانی کی علمی کاوشوں کا مرہون منت ہے، جب کہ قاضی ابو یوسف کا منصب قضا اس کی نشرو اشاعت کا مؤثر ذریعہ ہے۔ جیسا کہ خود شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشہور تالیف حجتہ اللہ البالغہ میں اسباب اختلاف الفقہاء فی الفروع کے تحت اس موضوع کا خلاصہ پیش کیا ہے اور اصول فقہ کے باب میں امام شافعی کی تالیف شہیر ”الرسالۃ“ کو اول تالیف گردانا ہے اور یہی درست ہے۔ بہر حال امام ابوحنیفہ ایک بزرگ عالم و فقیہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ علم حدیث میں عدم رسوخ کے سبب ان کی فقہ مسائل شرعیہ میں دیگر

کرام کی فقہ کے مقابلے میں صحت و صواب سے بعید ہے۔ بایں ہمہ ذاتی طور پر ان سے بغض و عناد رکھنا یا ان کے خلاف صف آرا ہونا کسی حال میں درست نہیں ہے۔ البتہ مسائل کی تحقیق و تنقیح میں مخالف ادلہ شرعیہ صحیحہ اقوال پر رد کرنا علماء کا دینی فریضہ ہے اور حق کی توضیح و تبیین میں کسی قسم کی مداخلت جائز نہیں ہے بشرطیکہ ادب و احترام ملحوظ خاطر ہو۔

مولانا وحید الدین خاں:- میرے نزدیک امام ابوحنیفہ نے جو اصول وضع کیے وہ کلی

معنی میں درست نہ تھے۔ ان کی اصول سازی میں ایک ایسی چیز شامل ہوگئی جو روح شریعت کے مطابق نہ تھی اور وہ ہے فقہیت۔ مثال کے طور پر امام ابوحنیفہ کا یہ اصول کہ الحق لا یتعدد سب سے بڑی وجہ ہے کہ مسالک فقہی کا اختلاف شدید بن گیا۔ حالاں کہ یہ شدت ایک ایسا غلط تھا جو اسلام میں ممنوع ہے۔

مولانا عبدالحمید نعمانی:۔ یہ تنگ نظری اور ایک طرح کی معاندت کا معاملہ ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا جو منہج تحقیق ہے اور استنباط کے جو اصول و ضابطے ہیں، ان میں بہت گہرائی ہے، بہت بلندی ہے، جیسا کہ امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے میزان الشریعۃ ۱ ی میں یہ بات لکھی ہے کہ جب یہ لوگ اپنی کم فہمی کی وجہ سے اسے سمجھ نہیں پاتے تو مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ حضرت امام اعظم سے خصوصی معاندت کی کچھ خاص وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ۱ میں اقدم ہیں۔ بہت سی روایتوں کے مطابق انہوں نے کئی ایک صحابہ کو دیکھا ہے اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی فقہ عملی شکل میں مدون ہوگئی۔ حکمرانوں نے باب قضاء میں اس کو نافذ کیا۔ ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مقلدین میں امام ابوحنیفہ کی تقلید کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ ۹۵ فی صد مقلدین امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کرتے ہیں تو اب مخالفین تقلید نے یہ دیکھا کہ ہم جہاں جاتے ہیں، دنیا کے جس خطے میں پہنچتے ہیں وہاں حنفی پہلے سے موجود ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کا مقابلہ بھی زیادہ تر احناف سے ہی ہوتا ہے اور جواب دینے والے بھی یہی ہوتے ہیں، ان کی کاٹ کرنے والے بھی زیادہ احناف ہی ہوتے ہیں، اس لیے فطری طور پر ان کو عداوت بھی سب سے زیادہ امام ابوحنیفہ اور فقہ حنفی سے ہوتی ہے۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کو لگتا ہے کہ کتاب و سنت کا نعرہ تو ہم لگاتے ہیں، مگر جب عوام کو رجوع کرنا ہوتا ہے تو وہ حنفی مفتیوں سے رجوع کرتے ہیں کہ دنیا میں زیادہ وہی ہیں۔ خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں جو ان کی مخالفتیں ہوئیں وہ اسی لیے ہوئیں کہ لوگ دیکھتے تھے کہ حدیث کی خدمت تو ہم کر رہے ہیں، لیکن عوام کا رجوع امام ابوحنیفہ کی طرف ہوتا ہے۔ حالاں کہ یہ واضح سی بات ہے کہ کوئی مریض دوا خانہ نہیں جاتا، جہاں ہزار

وں طرح کی دوائیں ہوتی ہیں، ہر کوئی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ تو محمد کی مثال دوا خانے والے کی ہے، جن کے پاس دوائیں تو بہت سی ہیں، لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ کون سی دوا کس مرض میں کام آئے گی۔ یہ کام مجتہد کرے گا، جس کی دواؤں کی ساخت پر، ان کے اثرات پر اور مریض کی حالت پر گہری نظر ہے۔ تو عوام کا فقہ حنفی کی طرف رجوع کرنا بھی امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی ایک بہت بڑی وجہ ہے اور اس کا سلسلہ بہت دراز ہے۔ چوں کہ فقہ حنفی کی عمر سب سے لمبی ہے، اس لیے اس کی مخالفت کا تسلسل بھی سب سے زیادہ دراز ہے۔

سوال (۷):۔ تقلید شخصی کا مفہوم کیا ہے اور امت کو اس کی ضرورت کیوں ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:۔ جو شخص اجتہاد کی اہلیت نہیں رکھتا مگر مجتہدین کے اقوال تک اس کی رسائی ہے اور بے شمار متفقہ مسائل کے علاوہ بڑی تعداد میں ایسے مسائل بھی ہیں جن میں مجتہدین کے نتائج فکر مختلف ہیں، ایسی حالت میں وہ کسی ایک ہی مجتہد کی پیروی کر سکتا ہے، اسی کا نام تقلید شخصی ہے، اس کے لیے بھی اس مجتہد کے اصول و فروع کو جاننا، سیکھنا، پوچھنا، سمجھنا ضروری ہے، اگر وہ بیک وقت دو مجتہد کے قول مثلاً جواز و عدم جواز دونوں پر عمل کرنا چاہے تو یہ جمع نفیضین کی آرزو ہوگی جس کا وقوع محال ہے اور اگر یہ چاہے کہ جس وقت جو آسان معلوم ہوا اسے اپنالیا کرے تو یہ شریعت کی نہیں ہوائے نفس کی پیروی ہوگی اور اگر اسے یہ تکلیف دی جائے کہ تمام مذاہب کی تحقیق کرو، ہر قول کو کتاب و سنت اور قیاس و اجتہاد کی روشنی میں پرکھو جو زیادہ درست اور مطابق دلائل نظر آئے اسے لے لو، دوسرے کو چھوڑ دو تو یہ ایک عامی کی قوت و صلاحیت سے باہر ہے، جس کا وہ مکلف نہیں، وہ ساری عمر کھپا کر بھی اتنی اہلیت پیدا کرنے سے عاجز ہے پھر عمل کب کرے گا؟ قبر میں جانے کے بعد یا میدان قیامت میں؟ اور اگر کوئی عالم بے قید تیار ہو جائے کہ تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے تمام ۱ کے اقوال و دلائل کی تحقیق تام فرمانے کے بعد ایک بے نظیر معجون مذاہب تیار کیا ہے، تم اسے لے لو اور حسب ضرورت استعمال کرتے رہو، اس میں ساری مشکلات سے نجات ہے اور یہ ساری آسان ۱ کا انتخاب لا جواب ہے۔ اب وہ شخص وہ نسخہ کیسیا ہاتھ میں لے اور آنکھ بند کر کے اس پر عمل کرتا رہے تو یہ بارہ سو سال پہلے کے کسی امام کو

چھوڑ کر پندرہویں صدی کے ایک عالم بے قید کی تقلید شخصی ہوگی اور آج اسی پر پوری دنیا کے غیر مقلدین سختی سے کاربند ہیں۔

مگر بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ابتدائی دو صدیوں کے بعد سے ہی پوری دنیائے اسلام ایک امام مجتہد کی پابندی پر کاربند ہے، پھر فرق کیا رہا؟ صرف یہ کہ قدیم امام جو علم و تقویٰ، فقاہت و اجتہاد، عہد رسالت سے قرب و غیرہ ہر لحاظ سے اعلیٰ و اعظم تھا اسے چھوڑ کر آج کے ہر لحاظ سے اثنی و پست شخص کی پیروی ہو۔

ایک امام معین کی پیروی بھی اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ خدا و رسول کے احکام سے ہمیں باخبر کرتا ہے اور جہاں جہاں اس نے خود اجتہاد کیا ہے تو اپنی طرف سے اس نے کوئی چیز حلال یا حرام نہیں ٹھہرائی ہے، بلکہ نصوص کتب و سنت میں نظر غائر کے نتیجے میں جس چیز کو اس نے خدا و رسول کے یہاں حلال جانا ہے، اسے حلال بتایا ہے، جسے حرام جانا ہے، اسے حرام بتایا ہے اور ہم نے اس کی دیانت و تقویٰ کا مشاہدہ اور اس کے رسوخ علم کا تجربہ بالواسطہ یا بلا واسطہ کر لینے کے بعد اس پر اعتماد کیا ہے اور اس کے اقوال کو قبول کیا ہے۔

مولانا عبد الوہاب خلیجی: تقلید شخصی، یعنی غیر نبی ﷺ کا مطلق التزام اور تمام امور میں کسی ایک عالم و فقیہ کی مکمل اقتداء ایک حرام، منکر اور اجماع کے خلاف امر ہے۔ بعض حالات میں اور کچھ ضروری قیود و حدود کے ساتھ بعض علماء نے تقلید کو جائز قرار دیا ہے جس کے لیے کتب اصول کا مراجعہ کرنا چاہیے۔ یقیناً امت مسلمہ کی بھلائی اُسی راستہ کی پیروی میں ہے جس کی پیروی سلف صالحین صحابہ و تابعین نے کی۔ چنانچہ امام احمد کا مشہور قول ہے ”لا تقلدونی ولا تقلدوا مالکاً ولا الشافعی ولا الازماعی ولا الثوری وخذوا الاحکام من حیث اخذوا“ نہ میری تقلید کرو اور نہ مالک، نہ شافعی، نہ اوزاعی اور نہ ثوری کی تقلید کرو بلکہ احکام وہاں سے لو جہاں سے یہ حضرات اخذ کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ اپنے شاگرد خاص امام ابو یوسف کو نصیحت فرماتے ہیں ”اننا بشر نقول القول الیوم و نرجع عنه غداً“ یعنی مجھ سے سنی ہوئی ہر بات مت لکھ لیا کرو، کیونکہ ہم بشر ہیں، آج ایک بات کہتے ہیں اور کل اس سے پلٹ جاتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کا مشہور قول ہے ”اذا صح

الحديث فهو مذهبی، یعنی جب صحیح حدیث مل جائے تو اسی کو میرا مذہب سمجھو اور امام مالک کا فرمان ”لن یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح به اولها“ یعنی امت کا آخری دور اس وقت اصلاح و درستگی کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اوائل امت کی راہ اختیار نہ کرے۔ (یعنی منہج صحابہ پر کتاب و سنت کی کامل پیروی کے بغیر امت کی اصلاح ممکن نہیں) (ایسقاط الہم للفلانی و اعلام الموقعین لابن القيم و المیزان للشعرانی وغیرہ)

تقلید شخصی کے وجوب کے قائلین کے پاس مغالطات کے سوا کوئی معتبر دلیل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف اور کتاب اللہ و سنن صحیحہ کی پیروی کا جذبہ خالص ہی انسان کو اباحت اور فکری و عملی انارکی سے نجات دے سکتے ہیں۔ ورنہ بعض فقہاء (ساجم اللہ، اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے) کی حلت و حرمت کے باب میں حیلہ سازیاں اہل علم و تحقیق سے مخفی نہیں۔ لہذا امت کو نہ صرف یہ کہ تقلید کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اتحاد امت کے لیے یہ زہر ہلا ہل ہے۔ تقلید شخصی کے رواج سے پہلے کی ابتدائی چار صدیوں میں امت مسلمہ کے متعلق مقلدین کیا رائے قائم کریں گے جو کسی ایک متعین شخص کی تقلید پر متفق نہ تھی؟ جب کہ قرون مفصلہ، بہترین ادوار میں اسلام نے نمایاں ترقی کی ہے اور یہ ترقی صرف اتباع کتاب و سنت کا ثمرہ تھی۔

مولانا وحید الدین خاں: میرے نزدیک تقلید شخصی اصولاً ایک نادرست چیز ہے۔ وہ صرف ضرورت شرعی کی بنا پر درست قرار پاسکتی ہے اور وہ یہ کہ جو آدمی براہ راست عربی مأخذ سے مسئلہ دریافت کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو، وہ کسی ایسے شخص کا مقلد بن جائے، جس کے علم اور نیت پر اس کو اعتماد ہو۔

مولانا عبد الحمید نعمانی: ابھی جیسا کہ میں نے بتایا کہ منصوص مسائل میں تقلید کی ضرورت نہیں ہے اور ایسے ہی جو مسائل اجماعی ہیں، متفق علیہ ہیں، ان میں بھی تقلید کا کوئی سوال نہیں اٹھتا۔ ہاں! جو غیر منصوص مسائل ہیں اور ان میں مجتہدین کے مابین اختلاف ہو گیا ہے، اب ان مسائل میں ہم سب کی باتیں کیسے مان سکتے ہیں؟ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ تو اب یہیں پر تقلید کی ضرورت پڑتی ہے، کیوں کہ کوئی عمل جب بھی کرے گا تو ایک ہی پر کرے گا۔

تقلید شخصی دراصل اتباع ہو اسے روکنے کے لیے ہے، تقلید شخصی نہیں ہوگی تو جس کو جو مسئلہ

الدم ہیں، وہ ”اتخذوا احبارہم و رہبا نہم اربابا من دون اللہ“ کے مصداق ہیں، وہ ا کی تحلیل و تحریم کو مان کر ان کے پجاری ٹھہرے، اس لیے چھ سو سال کی پوری امت شرک خالص پر گزری۔

اس دعوے کا تقاضا یہ تھا کہ غیر مقلدین ایسا مجموعہ احکام منظر عام پر لاتے جو صرف کتاب و سنت کی تصریحات پر مشتمل ہو اور کسی امام کے قیاس و اجتہاد اور تحلیل و تحریم سے یکسر خالی ہو، مگر یہ کام غیر مقلدین سے آج تک نہ ہو سکا۔ جیسے چکرالوی فرقہ نے صرف کتاب اللہ کے اتباع کا نعرہ بلند کیا، مگر کوئی ایسا نظام عمل پیش کرنے سے عاجز رہے جو صرف قرآن مجید کی تصریحات پر مشتمل اور تمام شعبہ ہائے زندگی پر حاوی ہو۔

غیر مقلدین کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہ پیش کر سکے جو کتاب و سنت میں ان کے اجتہاد کا ثمرہ ہو۔ ان کا کارنامہ بس یہ رہا کہ بزعم خویش ”تقلید جامد“ سے ہٹ کر ”تقلید سیال“ پر آگئے۔ یعنی کسی ایک امام کا پورا مذہب اختیار کرنے کے بجائے اپنی راحت بدن اور ہوائے نفس کے مطابق مختلف مذاہب سے کچھ کچھ مسائل چھانٹ کر ایک مجنوں مرکب تیار کر لیا۔ اب وہ خود ہی بتائیں کہ ایک امام کی تحلیل و تحریم کو ماننے والا ”اتخذوا احبارہم و رہبا نہم اربابا من دون اللہ“ کا مصداق ہوا تو چند اماموں کی تحلیل و تحریم کو ماننے والا اس کا مصداق کیوں نہیں ہوا؟ وہ تو کسی ایک حبر و راہب نہیں بلکہ بقول آپ کے واقعہ چند احبار و رہبان کو اربابا من دون اللہ بنانے والا ہے، وہی تو اس کا سچا اور پورا پورا مصداق ہے؛ اگر یہ کہیں کہ ہم نے چند احبار کو اپنی تحقیق اور اتباع کتاب و سنت کے تحت مانا ہے تو ایک امام کا مقلد بھی یہی کہتا ہے کہ ہم نے اپنے امام کو خدا یا رسول نہیں مانا ہے، بلکہ خدا کا بندہ، رسول کا امتی، ان کے ارشادات کا غواص اور ان کے احکام کا مبلغ اور مظہر ہی مانا ہے اور ہمیں بھی تحقیق سے معلوم ہے کہ انہوں نے نہایت اخلاص و امانت، کمال علم و ادراک اور وفور آلات اجتہاد کے ساتھ کتاب و سنت کے سمندر میں غواصی کر کے احکام شریعت کے تابناک گوہر نکالے ہیں اور ہم نے ہاتھوں ہاتھ لیے ہیں تاکہ خدا و رسول کی اطاعت اور زندگی کے ہر شعبے میں شریعت حقہ کی پیروی ہو سکے۔

جہاں آسان نظر آئے گا اس کا اتباع کرے گا تو گویا یہ شریعت کی نہیں اپنی طبیعت کی پیروی ہوگی۔ اب مثال کے طور پر ایک شخص نے وضو کیا اور مس ذکر کر لیا تو ایک امام کے نزدیک تو اس کا وضو ٹوٹا، دوسرے کے نزدیک نہیں ٹوٹا۔ پھر وضو کے بعد اس کے جسم سے خون نکل آیا تو ایک کے نزدیک تو وضو ٹوٹ گیا، دوسرے کے نزدیک نہیں ٹوٹا۔ تو ایک ہی وقت میں اس نے مس ذکر بھی کر لیا اور اس کے بدن سے خون بھی نکل آیا تو اس کا وضو تو دونوں اماموں کے نزدیک ٹوٹ گیا۔ اب گویا اس نے بغیر وضو کے ہی نماز پڑھی۔ اب وہ کہے کہ مس ذکر کے مسئلہ میں ہم نے امام ابوحنیفہ کی پیروی کی اور خون کے مسئلہ میں امام شافعی کی پیروی کی۔ اس طرح میری نماز درست ہوگئی، کیوں کہ دونوں امام برحق ہیں۔ تو اس کا یہ فریب دراصل اماموں کی تقلید نہیں، ہوائے نفس کی تقلید ہے۔ اسی لیے تقلید شخصی ضروری ہے۔ ایک ساتھ دو چار کی تقلید نہیں کی جاسکتی۔ اسی لیے منطق کا مسئلہ ہے کہ آن واحد میں دو چیزوں کی طرف فکر کا انتقال بھی محال ہے اور عمل بھی بہ یک وقت محال ہے۔

علاوہ ازیں تقلید مطلق تو سب کے نزدیک جائز ہے، قرآن کا حکم ہے کہ فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔ اس کو سب مانتے ہیں اور یہ اصول ہے کہ جو چیز کلیات میں جائز ہوگی وہ جزئیات میں بھی جائز ہوگی تو جب تقلید مطلق جائز تو عقلی طور پر تقلید شخصی جو تقلید مطلق کی ہی فرع ہے ضرور جائز ہونی چاہیے۔

اس کے ساتھ ایسا بھی نہیں کہ حالات و ضروریات سے آنکھیں موند کر تقلید کی جاتی ہو۔ تقلید شخصی کے اندر بھی اس بات کی وسعت ہے کہ اگر ضرورت ہو، مجبوری ہو تو ہم توسع کے لیے دوسرے امام کے قول پر عمل کر سکتے ہیں۔ جیسے مفقود الخبر شوہر کے بارے میں اب ہمارے یہاں امام مالک کے قول پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ تقلید شخصی کا معنی ہرگز تقلید جامد نہیں ہے۔

سوال (۸): - تقلید کی مخالفت کے پیچھے کیا واقعی ”دعوة الی الکتاب والسنة“ کا جذبہ کارفرما ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی: - غیر مقلدین نے پہلے تو بہت شد و مد کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ کتاب و سنت کی پیروی کرو، ا کی پیروی شرک جلی ہے اور تمام مقلدین مشرک مباح

الحاصل تقلید کی مخالفت کے پیچھے اتباع کتاب و سنت کا جذبہ کارفرمانہیں، بلکہ اتباع نفس کا جذبہ کارفرما ہے۔ یا ان ہی کے الفاظ میں ”تقلید جامد“ سے ہٹ کر ”تقلید سیال“ کا راحت بخش داعیہ کارفرما ہے۔

مولانا عبدالوہاب خلمی: تقلید کی ضد اتباع ہے اور تقلید کا لفظ اپنے عرفی معنی میں ایک محدث لفظ ہے۔ لہذا مقصود اصلی بنیادی طور پر اتباع کتاب و سنت ہونا چاہیے اور تقلید جامد کی مخالفت کرنے والوں کا محض نظر بھی یہی ہے۔

مولانا وحید الدین خاں: تقلید کی موجودہ مخالفت میرے نزدیک صرف کٹر پن یا گروہی عصبیت کی بنا پر ہے۔ میں تقلید کا جزوی مخالف ہوں۔ یعنی عوام کے لیے تو میں تقلید کو درست مانتا ہوں، لیکن خواص اہل علم کے لیے نہیں۔

مولانا عبدالحمید نعمانی: ممکن ہے بہت سے لوگوں کی نیت صالح ہو، لیکن بیشتر لوگ نیک جذبات کے تحت کتاب و سنت کی دعوت نہیں دیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اکثر لوگوں کے نزدیک اصل مسئلہ ہوتا ہی نہیں ہے۔ میں یہ قطعی طور پر نہیں مان سکتا کہ ان کے سینوں میں ا، صالحین، اسلاف اور اولیاء اللہ سے زیادہ اتباع شریعت کا جذبہ موجود ہے۔ جتنے اولیاء کرام اور بزرگان دین ہوئے ہیں سب کا مطالعہ کر جائیے، حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ تک، یا دوسرے اولیاء کرام ہیں، مثلاً خواجہ غریب نواز، حضرت صابر کلیری، شہاب الدین سہروردی یا آج بھی جتنے صالح لوگ ہیں، سب کسی نہ کسی امام کے مقلد ہیں تو کیا آج جو لوگ کتاب و سنت کے نام پر تقلید کی مخالفت کر رہے ہیں، ان کے اندر ان حضرات سے زیادہ جذبہ اتباع شریعت ہے؟ جی نہیں! کتاب و سنت کی دعوت کا آخر معنی ہے کیا؟ کیا انہوں نے کتاب و سنت سے ہٹ کر کوئی قانون بنایا؟ کتاب و سنت کے منشا تک پہنچنے کے لیے اور پورے طور پر شریعت کا اتباع کرنے کے لیے ہی انہوں نے اجتہاد کیے ہیں۔ تو اجتہاد کتاب و سنت کی دعوت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ ہم یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ اور مجتہدین کا جو فہم ہے، یہ عام لوگوں کے فہم سے بڑھ کر ہے۔ اس میں نسبتاً یہ احتیاط ہے کہ ہم اپنے سے بالا تر فہم والے کے اوپر اعتماد کر کے قرآن و سنت کا اتباع

کریں۔ یہ کتاب و سنت کی حقیقی پیروی ہے، مخالفت نہیں۔ پھر کتاب و سنت کی دعوت دینے والے کوئی نمونہ بھی تو پیش کریں، جس کو ہم کہیں کہ یہ کتاب و سنت کی دعوت ہے اور اس سے ہٹ کر کتاب و سنت کی مخالفت ہے۔ انہوں نے اب تک کوئی نمونہ پیش نہیں کیا ہے۔

سوال (۹): غیر مقلدیت کا وجود کب سے اور کیوں ہوا؟

مولانا محمد احمد مصباحی: ہندوستان میں شاہ اسماعیل دہلوی نے اس کی تخم ریزی کی اور میاں جی نذیر حسین دہلوی نے اس کی کاشت تیار کی، یعنی یہ پودا تیرہویں صدی کے ربع دوم میں لگا اور ربع سوم و چہارم میں پیداوار مارکیٹ میں فروخت ہونے لگی۔

مولانا عبدالوہاب خلمی: مقلدیت اور غیر مقلدیت جیسا کہ عرض کیا گیا اصطلاح حادث ہے۔ اصل دین، اتباع کا نام ہے ”اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم“ لہذا اتباع کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود اسلام کی تاریخ۔ ولله الحمد۔ اگر کوئی اربعہ کی تقلید کو حرام اور بعد کے کسی عالم کی تقلید کو واجب گردانتا ہے تو اس کی مثال ”فر من المطر وقام تحت المیزاب“، یعنی بارش سے بچنے کے لیے پرنا لہ کے نیچے کھڑے ہونے کی ہے۔ ہر حال میں دلیلوں کی پیروی اور حق کا اتباع واجب ہے۔ کسی عالم و فقیہ کی وہی بات لائق اخذ و اعتناء ہے جو دلیل سے مبرہن ہے اور ایسی صورت میں اصل اتباع، دلیل کا ہے نہ کہ اُس عالم کا۔ یہی وجہ ہے کہ خالی از دلیل یا مخالف دلیل قول کا متبعین کتاب و سنت کی دنیا میں کوئی اعتبار نہیں۔ چاہے اس کا قائل وقت کا بڑے سے بڑا عالم کیوں نہ ہو۔ لہذا سوال تو یہ مناسب تھا کہ مقلدیت کا وجود کب سے ہوا؟ کیونکہ اتباع اصل شئی ہے اور تقلید شئی حادث یعنی چوتھی صدی ہجری کی پیداوار۔ (سوال نمبر ۹/۱۰ کا جواب اسی میں ہے)

مولانا وحید الدین خاں: غیر مقلدیت کے آغاز کی قطعی تاریخ بتانا، شاید ممکن نہیں ہے۔ لیکن عام طور پر اس کا آغاز غالباً امام ابن تیمیہ سے شروع ہوتا ہے۔

مولانا عبدالحمید نعمانی: اس طرح کے کچھ لوگ ہمیشہ رہے ہیں جو امت کی عام روش سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں۔ لیکن انہیں آپ شرذمہ قلیلہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ امت کا عام رویہ نہیں ہے، اسے آپ امت کے Main stream سے کٹے ہوئے انحرافی نظریے کی پیداوار

کہہ سکتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ غیر مقلدیت کا تو کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اسلامی تاریخ میں کوئی ایسا طبقہ نہیں، جسے ہم صحیح معنی میں غیر مقلد کہہ سکتے ہیں۔

سوال (۱۰): - غیر مقلدیت نے امت کو اربعہ کی تقلید سے آزاد کرایا ہے یا کسی دوسری تقلید میں الجھا دیا ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی: - ایک نئی تقلید میں الجھا دیا ہے، آزادی تو جب ہوتی کہ ہر غیر مقلد مجتہد ہوتا اور الگ الگ اجتہاد سامنے آتا۔ یا کم از کم یہی ہوتا کہ مثلاً رفع یدین یا آمین بالجہر، قرأت خلف الامام اور دوسرے صد ہا مسائل میں کسی کو امام ابوحنیفہ کی دلیل وزنی معلوم ہوتی، کسی کو امام مالک کی، کسی کو امام شافعی یا امام احمد بن حنبل کی اور ہر ایک اپنی تحقیق کے مطابق آزادی کے ساتھ بے روک ٹوک عمل کرتا۔

مگر صورت حال یہ ہے کہ ہزاروں غیر مقلد جنگلی اور گنوار ہیں جن کے لیے صحیح طور سے سورۃ فاتحہ پڑھنا یا اردو میں لکھا ہوا ترجمہ قرآن سمجھنا بھی دشوار ہے، وہ اجتہاد یا تحقیق کیا کریں گے؟ کچھ غیر مقلد اگر عالم ہیں تو سب کا مذہب وہی ہے جو میاں جی اور ان کے معاصر و موافق رفتا نے ثبت قرطاس فرما دیا۔ کوئی شخص اس سے سر موأخراف کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ نتیجہ سامنے ہے کہ نہ آزادانہ اجتہاد رہا، نہ آزادانہ تحقیق اور فکر و جستجو، ایک طے شدہ مقررہ اور احبار و رہبان کے ہاتھوں نئی کتابوں میں درج شدہ مذہب کی ”تقلید جامد“ رہ گئی۔ اجتہاد تو ان کے یہاں کچھ تھا نہیں ”تقلید سیال“ بھی رخصت ہو گئی۔

مولانا وحید الدین خاں: - بطور واقعہ اس معاملے میں جو نتیجہ نکلا ہے وہ یہی ہے کہ اس کی وجہ سے امت تقلید سے آزاد نہیں ہو سکی، بلکہ وہ ایک نئی تقلید میں مبتلا ہو گئی ہے۔

مولانا عبد الحمید نعمانی: - آپ کسی حدیث کو کہہ رہے ہیں کہ ضعیف ہے، کیوں کہہ رہے ہیں، اس لیے کہ اسے ذہبی نے بیہقی نے یا ابن کثیر نے ضعیف کہا۔ تو آپ کا اس حدیث کو ضعیف کہنا یہ تقلید ہوئی۔ تو جس طرح فن کے اندر آپ مقلد ہیں، تقلید کر رہے ہیں تو پھر احکام شریعت کے لیے جو فقہی اصول ہیں ان میں بھی آپ کو تقلید سے انکار کا حق نہیں پہنچتا۔ وہاں آپ کسی صاحب بصیرت کی ہی تقلید کر رہے ہیں جس نے کتاب و سنت سے

احکام استخراج کیے ہیں۔

سوال (۱۱): - جماعت سلفیہ اور جماعت اہل حدیث میں کچھ فرق بھی ہے یا اختلاف صرف ناموں کا ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی: - اصل میں غیر مقلدین کا جب وجود ہوا اور ابن عبد الوہاب کا اعتقادی مذہب انہوں نے اپنایا اور عمل میں مذاہب ا سے آزادی کا نعرہ بلند کیا تو مقلدین نے انہیں وہابی یا لامذہب یا غیر مقلد کا نام دیا۔ کوئی نام انہیں پسند نہ آیا۔ انہوں نے ماضی کی صدیوں کا مطالعہ کیا، ماضی میں سلفی اور محدث یا اہل حدیث نام کے گروہ انہیں نظر آئے، یہ نام انہیں اچھے لگے اور انہیں سے اپنی تشبیر گوارا کر لی، کبھی اپنے کو محمدی یا اثری بھی کہتے ہیں، شاید اور زیادہ اچھے نام کی تلاش ابھی جاری ہے۔

مولانا عبد الوہاب خلیجی: - جماعت سلفیہ، جماعت اہل حدیث اور انصار السنۃ، وغیرہ میں کوئی فرق نہیں، یہ نہج صحابہ و تابعین یعنی مطلق کتاب و سنت، ثابت اجماع اور قیاس شرعی کو حسب ضرورت قبول کرنے والی جماعت کے مختلف نام ہیں اور جب مقصود و منشور ایک ہو تو ناموں کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ”لا مشاحۃ فی الاصطلاح“

مولانا وحید الدین خاں: - جہاں تک میں جانتا ہوں دونوں میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے، ضمنی نوعیت کا فرق پایا جاسکتا ہے۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، دونوں کے درمیان حقیقی نوعیت کا کوئی فرق موجود نہیں۔

مولانا عبد الحمید نعمانی: - دیکھیے! جب آدمی کے سامنے کوئی مضبوط بنیاد نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید حاصل نہ ہو تو اسی طرح انتشار پیدا ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب مامون کے زمانہ میں خلق قرآن کا مسئلہ سامنے آیا اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے یہ پوچھا گیا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ اور ان پر جبر کیا گیا تو انہوں نے صاف صاف یہی کہا کہ ہم نے کتاب و سنت میں کہیں ایسا نہیں پایا اور نہ اپنے اسلاف سے سنا کہ یہ مخلوق ہے۔ اس لیے ہم اسے مخلوق نہیں کہہ سکتے۔ بعد میں اسی بنیاد پر امام احمد ابن حنبل کو ماننے والے اپنے آپ کو سلفی بھی کہنے لگے تو عالم عرب میں دراصل حنابلہ کو سلفی

کہا جاتا ہے، جو امام احمد ابن حنبل کے مقلد ہیں اور آج بھی عالم عرب میں وہی سلفی ہے جو حنبلی ہے، غیر مقلدیت کا تعلق سلفیت سے کچھ بھی نہیں ہے۔ غیر مقلدیت درحقیقت کتاب و سنت کی با بصیرت رہنمائی سے انحراف کا نام ہے اور جہاں تک اہل حدیث کا معاملہ ہے تو یہ بھی عجیب و غریب ہے۔ پہلے یہ محمدی تھی اور پھر اہل حدیث ہو گئے، پھر اپنے آپ کو سلفی کہنے لگے۔ یہ اس وقت ہوا جب عالم عرب میں پڑول نکلنا شروع ہوا اور یہاں کے اہل حدیث کے رابطے وہاں سے ہو گئے۔ اس سے قبل آپ کسی بھی اہل حدیث کے ساتھ سلفی لکھا ہوا نہیں دکھا سکتے تو اس کو ہم کیا کہیں کہ کل تک تو اہل حدیث رہے اور آج اچانک سلفی ہو گئے۔ اسی لیے ہمیں یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ جن کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہوتی وہ اسی طرح سے اپنا نام بدلتے رہتے ہیں۔

مولانا محمد حسین بٹالوی نے برٹش حکومت کے زمانہ میں اپنے طبقہ کا نام اہل حدیث رجسٹرڈ کرایا تھا۔ اس سے پہلے وہ محمدی کہلاتے تھے، تو بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے آدمی ہر طرف لڑھکتا رہتا ہے۔

اب رہا ہندوستانی اہل حدیث اور عالم عرب کی جماعت سلفیہ کے بیچ تقابل کی بات تو عالم عرب میں جتنے بھی سلفی ہیں، تقریباً سب کے سب مقلد ہیں، ہندوستانیوں کی طرح مخالف تقلید نہیں، پھر عموماً وہ حنبلی ہیں اور تھوڑے بہت شافعی اور مالکی بھی ہیں، لیکن ہندوستان کے اندر اہل حدیث کا جو نظریہ ہے اور مخالفت تقلید کی جو لہر ہے، اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں! اس کے باوجود اب ہندوستانی اہل حدیث ان کے ساتھ روابط کو بڑھانے کے لیے ان سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت کو شش کر رہے ہیں۔

علامہ شوکانی یمن کے ایک زیدی شیعہ تھے، انہوں نے تقلید کی مخالفت کا آغاز کیا اور ایک نئی روش پیدا کی تو ان کے بعد سے ہی یہ انحرافی رویہ چلا ہے۔ رہا علامہ ابن تیمیہ یا علامہ ابن قیم کا ذکر، جن کا یہ حضرات بہت چرچا کرتے ہیں تو خود وہ بھی غیر مقلد نہیں تھے، وہ سب کے سب مقلد تھے، حضرت غوث اعظم بھی مقلد تھے، اب یہ کہ بعض مسائل میں انہوں نے اختلاف کیا تو یہ ان کے اپنے تفردات ہیں، جیسے حنفیوں میں علامہ ابن ہمام کے تفردات

ہیں، شاہ ولی اللہ کے تفردات ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ علامہ ابن تیمیہ کے جتنے تفردات ہیں سب کی تعداد ۷۰/۷۲ ہے اور باقی مسائل میں وہ خود بھی مقلد ہیں، ان کو اہل حدیث غیر مقلد کہنا بالکل غلط ہے۔

سوال (۱۲): - جماعت اہل حدیث کا اختلاف صرف فقہی ہے یا نظری و اعتقادی بھی ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی: - غیر مقلدین اعتقاداً کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کے پابند ہیں اور عملاً ایک نئی تشکیل اور جدید تدوین کے، دونوں کی کچھ تفصیل جامع الشواہد میں محدث سورتی مولانا وصی احمد علیہ الرحمہ نے دی ہے۔

مولانا عبد الوہاب خلمی: - جماعت اہل حدیث پورے اسلام کی نمائندہ جماعت ہے، اور وہ مخالف کتاب و سنت و اجماع صحیح کسی عقیدہ و عمل یا فکر و نظر کو قبول نہیں کرتی۔ ویسے اربعہ رحمہم اللہ کے عقائد کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں اور بنیادی طور پر ان کے درمیان عقیدہ کے باب میں کوئی قابل ذکر لحاظ اختلاف نہیں ہے۔ صوفیہ اور خانقاہیوں کے درمیان مروجہ عقائد میری مراد نہیں ہیں، کیونکہ اربعہ میں سے بعض کی طرف انتساب کرنے والے بہت سے لوگ عقائد کے اعتبار سے اشعری اور ماتریدی ہیں اور تصوف کے متعلق مزید چار سلسلے رائج اور مشہور ہیں، جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں۔

مولانا وحید الدین خاں: - جہاں تک میں جانتا ہوں، جماعت اہل حدیث کا اختلاف دونوں نوعیت کا ہے۔ فقہی مسائل کے اعتبار سے بھی اور اعتقادی مسائل کے اعتبار سے بھی۔

مولانا عبد الحمید نعمانی: - غیر مقلدین کے زیادہ تر اختلافات فقہی ہیں، لیکن کچھ ایسے مسائل بھی ہیں جو نظریاتی ہیں، یہ نظریاتی اختلافات ان لوگوں نے شیخ ابن تیمیہ کے اتباع میں اپنا لیے ہیں، مثلاً یہ کہ اللہ فوق میں ہے اور یہ کہ انسانوں کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں بھی ہیں، تو اس طرح کے نظریاتی اختلاف کے اندر اگر ہم احتیاط کریں اور ان کی تکفیر نہ کریں تو کم از کم وہ گم راہ تو ہیں ہی۔ ان کی گمراہی میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

جذبہ ان سے بہت زیادہ ہوتا ہے جو صرف کتاب و سنت کے نام سے اپنا کام چلانا چاہتے ہیں، کون کتاب و سنت کی پیروی کو اولین اور بنیادی فریضہ نہیں سمجھتا؟ ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کتاب و سنت کے مطالبات پر زیادہ سے زیادہ عمل کرے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ کتاب و سنت کی دعوت نے لوگوں کو اتباع شریعت کی طرف متوجہ نہیں کیا ہے، بلکہ دین کے اتباع پر جو سماج قائم تھا، اس میں انتشار و خلفشار پیدا کر دیا ہے اور عوام ذہنی طور پر سخت الجھن کا شکار ہو گئے ہیں۔

سوال (۱۴): عالمی تناظر میں مسلمانوں کے حوالے سے سعودی عرب کے منفی کردار میں اس کی غیر مقلدیت کا کیا کردار ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی: سعودی عرب میں رہنے والے شیوخ نجد کو غیر مقلدیت سے زیادہ عقیدہ و ہابیت سے دلچسپی ہے اور اس کو وہ طاقت، دولت، افراد وغیرہ کے ذریعہ پھیلانے میں منہمک ہیں، وہ حنبلیت کے مدعی ہیں، مگر اقتدار پر قابض ہونے کے بعد دیگر مذاہب کے مصلے مسجد حرام سے ختم کر دیے۔ تعظیم و احترام کو عبادت اور شرک کہتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے آثار و مقابر کو اصنام کا درجہ دیتے اور ان کی شکست و ریخت کو بت شکنی سمجھتے ہیں۔

مولانا عبدالوہاب خلیجی: سعودی عرب کے کردار پر لوگوں کی آراء مختلف ہو سکتی ہیں۔ میرا حسن ظن ہے کہ سعودی عرب کی اسلامی حکومت امت مسلمہ کے مفاد میں کام کر رہی ہے اور ”رموز مملکت خولیش خسرواں دانند“ کے تحت وہ جو بھی قدم اٹھا رہی ہے اس کے پیچھے دور رس مقاصد کار فرما ہیں۔ دور دراز علاقوں میں بیٹھے اور جھوٹ و بے سروپا باتوں کی اشاعت کرنے والے میڈیا کے دام فریب میں مبتلا حضرات کو خواہ مخواہ اس مملکت سے بدگمانیاں اور خدرا میر ہیں، جب کہ یہ حکومت بفضلہ تعالیٰ شدت پسندی کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر رہی ہے اور آج بھی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی دہشت گردی سے نبرد آزما رہے گی۔ حکومت کا منشور اتباع کتاب و سنت اور رد بدعت کے ساتھ امت مسلمہ کی خیر خواہی ہے اور شاید ان ہی اصولوں پر کار بند ہونے کے سبب مسلمانوں کے بعض طبقات کو اس حکومت سے بلاوجہ رد و کد

سوال (۱۳): غیر مقلدیت نے ”دعوة الی الکتاب والسنة“ کے نام پر امت کو متحد کیا یا اس کے انتشار کے مزید سامان بہم پہنچا دیے؟

مولانا محمد احمد مصباحی: امت اربعہ کو برحق مانتے ہوئے اپنے اپنے امام کی تقلید پر مطمئن تھی، غیر مقلدیت کے وجود میں آتے ہی انتشار اور جنگ و جدال کا ماحول برپا ہو گیا۔ فوجداری، مقدمہ کورٹ، کچہری سب کی نوبت آئی اور سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

مولانا عبدالوہاب خلیجی: اہل حدیث اور انصار السنۃ، امت کو یقیناً کتاب و سنت اور اعتصام بحبل اللہ کے پلیٹ فارم پر متحد کرنے کے آرزو مند ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تعداد میں اضافہ فرمائے اور کوششوں کو بار آور کرے۔ جماعت اہل حدیث نے ہمیشہ امت کو انتشار سے بچانے اور شاہراہ قرآن وحدیث پر متحد کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ پہلے بھی امت کا اتحاد کتاب و سنت پر قائم تھا اور آج بھی اسی متحدہ پلیٹ فارم پر اتحاد قائم اور راسخ ہو سکتا ہے۔ کاش! لوگ غور و فکر سے کام لیتے۔

مولانا وحید الدین خاں: اس سوال کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ اس کوشش کا عملی نتیجہ منفی صورت میں نکلا ہے اور اس کا سبب غلو ہے۔ جب بھی غلو کا طریقہ اختیار کیا جائے گا ہمیشہ اس کا نتیجہ منفی صورت میں برآمد ہوگا۔

مولانا عبدالحمید نعمانی: ہر باطل تحریک ایک خوشنما نام کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ معتزلہ کی تحریک اصحاب العدل والتوحید کے نام سے اٹھی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ گمراہی تھی، قادیانیت کی تحریک کو دیکھیے وہ تحفظ ختم نبوت کی تحریک، خدا کی نعمت کی تحریک بتا رہے ہیں، تو اس طرح کی جتنی تحریکیں ہوتی ہیں، کسی خوب صورت نام کے ساتھ ہی سامنے آتی ہیں اور یہ باطل کی کمزوری ہے کہ وہ کبھی بھی اپنی اصلیت کو واضح کر کے سامنے نہیں آسکتی۔ شیطان اپنی ہر شیطانی کو خوب صورت بنا کر پیش کرتا ہے، اس طرح کی تمام انحرافی تحریکوں کا یہی حال ہے، ان کا کتاب و سنت کی دعوت یا اتباع شریعت کے جذبے سے اصلاً کوئی تعلق نہیں ہوتا، آج بھی وہ لوگ جو اسلاف کے حقیقی معنی میں اتباع کرتے ہیں، صحابہ، تابعین، تبع تابعین، مجتہدین اور اولیاء اللہ کا احترام کرتے ہیں، ان کے اندر اتباع شریعت کا

ہے۔ ویسے میرا یہ بھی دعویٰ نہیں کہ حکومت اپنے ہر فیصلہ اور اقدام میں درست ہے، لیکن بہر حال اس کے محاسن، معائب پر غالب ہیں اور اگر کسی کو کوئی خامی و خرابی نظر آتی ہو تو دین خیر خواہی کا نام ہے۔ اس کو چاہیے کہ حکومت یا اس کے سفارت خانے سے رجوع کرے۔

مولانا وحید الدین خاں:۔ جہاں تک میں جانتا ہوں مسلمانوں کے حوالے سے سعودی عرب کا کوئی منفی کردار نہیں ہے اور اگر ہے تو مجھے اس کا علم نہیں۔

مولانا عبدالحمید نعمانی:۔ دیکھیے! ہم لوگوں نے جو دیکھا ہے، جو سمجھا ہے اور رابطہ ہونے کے بعد جب بات چیت ہوئی ہے تو اس کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سعودی حکومت اور وہاں کے ذمہ داران کا غیر مقلدیت سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، چاہے محمد بن عبد الوہاب ہوں چاہے آج کے دوسرے ذمہ داران ہوں، آل شیخ وغیرہ۔ ان کا تحریری بیان موجود ہے کہ ہم اربعہ کی توہین کے خلاف ہیں، ہم چاروں کا احترام کرتے ہیں اور ہم لوگ حنبلی ہیں اور ہمارا عقیدہ وہی ہے جو ہمارے اسلاف کا رہا ہے۔ لیکن یہ لوگ جو ہندوستان میں اہل حدیث اور غیر مقلد کے نام سے جانے جاتے ہیں، یہ اپنے آپ کو وہاں کی سلفیت سے جوڑ کر ایک طرح کی غلط فہمی اور مغالطہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، ورنہ سعودی حکومت کا وہاں بالکل ایسا کردار نہیں ہے کہ وہ غیر مقلدیت کو اہمیت دے۔ جب جمعیت العلماء نے تحفظ سنت کا نفرنس میں یہ سوال اٹھایا تھا تو وہاں کے ذمہ داروں نے باضابطہ کہا کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن ہاں! کچھ لوگ وہاں اس طرح کے نظریات کے حامل ضرور ہیں، جو با اثر بھی ہیں۔

سعودی کے اندر چوں کہ دو طبقات ہیں، ایک حکومت کا طبقہ ہے جسے ال سعود کہا جاتا ہے اور دوسرا مذہبی طبقہ ہے جسے ال شیخ کہا جاتا ہے۔ ال شیخ کے اندر کچھ لوگ ایسے ضرور رہے ہیں، جن کے اندر آزادی کا پہلو ابھرا ہوا ہے۔ لیکن ان کو آپ برصغیر میں جو معروف معنی میں اہل حدیث اور غیر مقلد کی اصطلاح ہے، اس معنی میں انہیں اہل حدیث یا غیر مقلد نہیں کہہ سکتے۔ لیکن وہاں پر جو حکومتی طبقہ ہے، ان کا جو مزاج ہے، اس سے بالکل ایسے آزاد رویہ کی تائید نہیں ہوتی ہے۔ حکومتی افراد تقریباً سب کے سب مسلک حنبلی ہیں۔ اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا

سکتا کہ حکومت کی وجہ سے غیر مقلدیت کو فروغ ہو رہا ہے۔ ہاں! لیکن یہ جو میں نے کہا کہ یہ لوگ کنفیوژن پیدا کرتے ہیں، تو یہ اپنے اس حربہ سے کہ وہاں پر اپنے کوان کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور یہاں پر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ سعودی میں ہمارے ہی نظریات کے لوگ ہیں۔ اس حربے سے ان کو ضرور فائدہ حاصل ہوتا ہے اور یہ اپنا فروغ کرتے ہیں۔

سوال (۱۵):۔ کیا اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے؟ اگر ہاں! تو کیوں؟ اور اگر نہیں تو عصر حاضر میں تحقیق و اجتہاد کی کون سی صورت ممکن یا واجب ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:۔ اجتہاد کی اجازت اہلیت سے مشروط ہے اور وہ صدیوں سے مفقود ہے، مگر انے جامع اصولوں کی روشنی میں فروع کا جو ذخیرہ ہمیں دیا ہے، اس میں پیدا ہونے والے اکثر مسائل کا حل بعینہ مل جاتا ہے اور کچھ کے لیے نظر و فکر اور الحاق کی ضرورت پیش آتی ہے، یہ کام انفرادی و اجتماعی طور پر ہر دور میں ہوتا آیا ہے اور آج بھی جاری ہے۔ اسی لیے مقلدین کے یہاں ہر نئے مسئلے کا حل مل جاتا ہے اور غیر مقلدین کے یہاں بے شمار پرانے مسائل بھی تشنہ ہیں۔

مولانا عبدالوہاب خلیجی:۔ اجتہاد کا دروازہ کس نے اور کب بند کیا کہ آج اس کے کھولنے کی ضرورت پیش آئی؟ مسائل لامتناہی ہیں اور شرعی اصول کے اندر ان کے حل کی پوری صلاحیت موجود ہے اور ماشاء اللہ متحدہ مسائل کے اندر امت کی رہنمائی کرنے والے علمائے راسخین سے بھی یہ دنیا خالی نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ قیاس و اجتہاد کے اصول کو نظر انداز نہ کیا جائے اور اس بحر کی شناوری وہی لوگ کریں جو اس کے اہل ہیں..... مع..... ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

مولانا وحید الدین خاں:۔ کچھ علماء کا یہ کہنا ہے کہ فقہائے اربعہ کے بعد کے زمانہ میں اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس رائے کی واحد بنیاد یہ ہے کہ ان کے نزدیک بعد کے زمانے میں علم کا رسوخ کم ہو گیا۔ یہ سبب اس ضمن میں بلاشبہ بے اصل ہے۔ کیوں کہ حدیث میں واضح طور پر موجود ہے کہ اجتہادی خطا پر بھی آدمی کو ایک ثواب ملتا ہے۔ میرے نزدیک اجتہاد کا دروازہ نہ کبھی بند ہوا ہے اور نہ کبھی بند ہو سکتا ہے۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ

مصطفیٰ ﷺ کی بالادستی کے لیے اٹھیں قلم کو ہمیز لگائیں اور بدعات و خرافات نیز جذبات و عواطف سے پرہیز کریں اور قارئین کرام حق و صواب کی جستجو میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں، اپنے آپ کو بدعتیہ اور عملی انحطاط سے محفوظ رکھیں، زور بیان و قلم اور علمائے سوء کی لہر ترانیوں سے متاثر نہ ہوں، بلکہ قرآن و سنت پر مبنی دلائل تلاش کریں اور انہیں کوحرز جاں بنائیں کیوں کہ معاملہ دین کا ہے اور الحمد للہ اللہ کا دین دلائل صحیحہ پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ حق کے کاموں پر ہم تمام لوگوں کا حامی و ناصر ہو۔ والسلام علی خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین والحمد لله رب العالمین۔

مولانا وحید الدین خاں:- ماہنامہ جام نور میرے پاس آتا ہے، میں اس کو ایک اچھا رسالہ سمجھتا ہوں، میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ میری دعاء ہے کہ ماہنامہ جام نور ہمیشہ ترقی کرتا رہے اور مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ نفع کا باعث بنے۔

مولانا عبدالحمید نعمانی:- ہمارا پیغام یہی ہے کہ کتاب و سنت سے ہماری وابستگی مضبوط سے مضبوط تر ہو اور جو صحابہ اور اکابر اور اولیاء اللہ اور بزرگان دین کا عمل ہے، جو توارث ہے، اس سے ہمارا رشتہ نہ ٹوٹنے پائے۔ اگر ہمارا رشتہ ان چیزوں سے چھوٹ جائے گا تو کتاب و سنت پر عمل کا دعویٰ مشکوک ہو جائے گا۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے جذبات کو صحابہ و تابعین، بزرگان دین و صالحین سے کم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ جب تک ان لوگوں سے ہماری وابستگی، عقیدت مندی مستحکم نہیں ہوگی، عمل میں وہ جذبہ صداقت نہیں آسکے گا۔

ہمارا بنیادی مقصد تو بلاشبہ کتاب و سنت پر عمل کرنا ہی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے اسلاف کو اپنا باغی سمجھیں، ہاں! اگر کسی مسئلے میں کسی سے کوئی خطا سرزد ہوگئی ہو تو ہم انہیں مطعون کرنے کی بجائے معذور سمجھیں گے۔ انہیں مطعون کرنا قطعی طور پر غلط ہے۔ انہیں معذور سمجھتے ہوئے کتاب و سنت کا جو صحیح منشا ہے اور جس پر امت عامل رہی ہے اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں اور کوئی ایسا عمل نہ کریں جو کتاب و سنت، اجماع امت اور اکابر کے توارث کے خلاف ہو اور نہ کسی طرح اپنے اندر اسلاف سے غلط فہمی پیدا ہونے دیں۔ □□□

اجتہاد ایک عبادت ہے اور عبادت کبھی بند نہیں ہوتی، اس سلسلے میں جو اصل بات ہے، وہ یہ ہے کہ اگر عالم کی نیت درست ہے تو اس کو اپنے اجتہاد کا ثواب ملے گا اور اگر اس کی نیت درست نہیں ہے تو اس کو اس کا ثواب نہیں ملے گا۔

عصر حاضر میں اجتہاد کی ایک لازمی ضرورت یہ ہے کہ عالم علم شریعت کے ساتھ علم زمانہ سے بھی بخوبی طور پر آگاہ ہو۔ مثال کے طور پر وہ عربی زبان کے علاوہ انگریزی زبان کی اچھی استعداد رکھتا ہوتا کہ اس کی پہنچ جدید مصادر تک ہو سکے۔ اس دو طرفہ علم کے بغیر کوئی شخص موجودہ زمانہ میں کامیاب مجتہد نہیں بن سکتا۔

مولانا عبدالحمید نعمانی:- اجتہاد کا دروازہ دور رسالت سے کھلا ہوا ہے، یہ دروازہ آج بھی کھلا ہوا ہے اور قیامت تک مسائل میں اجتہاد ہوتا رہے گا۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محققین نے یہی لکھا ہے۔ اگر اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا جائے تو عصری مسائل جو پیش آتے ہیں، ان کا حل کیسے پیش کیا جاسکے گا۔ اصل مقصد مسائل کا حل ہے۔ خواہ یہ اجتماعی سطح پر ہو خواہ انفرادی سطح پر، آج اجتہاد کا عمل اجتماعی سطح پر بہتر انداز میں ہو رہا ہے۔ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے اور نہ بند کرنے کا کسی کو حق ہے، آج چوں کہ مسائل بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں اور ہر مسئلے میں جدید و قدیم کو مد نظر رکھتے ہوئے بہت سے پہلو پیدا ہو گئے ہیں۔ پھر اجتہاد کے لیے جس طرح کی صلاحیت اہل علم میں چاہیے تھی تقریباً مفقود ہے، کوئی ایک آدمی ایسا نظر نہیں ہوتا جو خود ہی سارے مسائل کو حل کر دے، ایسی صورت میں اجتماعی اجتہاد بہت ہی بہتر اور قابل تعریف عمل ہے۔

سوال (۱۶):- ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے پیغام؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- ”جام نور“ خوب سے خوب تر، مفید سے مفید تر کی جستجو میں جادہ پیما ہے، اسی بنیاد پر قارئین بھی اس کے دل دادہ ہیں۔ دونوں کا سفر استقامت اور روز بروز ترقی کے ساتھ جاری رہے، یہی آرزو اور یہی پیغام۔

مولانا عبدالوہاب خلجی:- ماہنامہ جام نور کے مدیران اور مقالہ نگاران سے یہی گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کریں، اسلام کے اصل الاصول کتاب اللہ اور سنت

انقلاب ۱۸۵۷ء

۲۰۰۷ء انقلاب ۱۸۵۷ء کی ۱۵۰ سالہ یادوں کا سال ہے، یہ یادیں ہمارے لیے کئی جہتوں سے مفید بھی ہیں اور فکر انگیز بھی، یہ سال خاص طور پر ہمیں عصر حاضر میں آزادی و غلامی کے مسئلے پر غور کرنے، اپنا محاسبہ کرنے اور گزشتہ ڈیڑھ سو سالوں میں مسلمانوں نے کیا کھویا اور کیا پایا اس کا تجزیہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس خصوص میں ہم نے انقلاب ۱۸۵۷ء پر ماہنامہ جام نور کا ایک خصوصی شمارہ ترتیب دیا اور عصر حاضر کے دو عظیم اسکالر پروفیسر سید عزیز الدین احمد استاذ شعبہ تاریخ و ثقافت جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور مولانا یلین اختر مصباحی دارالقلم دہلی و سابق مدیر اعلیٰ ماہنامہ ”حجاز جدید“ دہلی کے خیالات بھی جاننے کی کوشش کی۔ اس موضوع کے لیے ان دونوں اسکالروں کے انتخاب کی وجہ یہ بنی کہ دونوں کا تاریخ سے خصوصی تعلق ہے اور دونوں ہی ۱۸۵۷ء پر علمی و تحقیقی کام کرنے میں مصروف ہیں۔ مولانا یلین اختر صاحب کی ۲۰۰۷ء میں پانچ کتابیں ”انگریز نوازی کی حقیقت“، ”چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء“، ”علماء قائدین جنگ آزادی ۱۸۵۷ء“، ”انقلاب ۱۸۵۷ء پس منظر و پیش منظر“ اور ”انقلاب ۱۸۵۷ء اور علامہ فضل حق خیر آبادی“ شائع ہو چکی ہیں اور کئی دوسری زیر اشاعت یا زیر تالیف ہیں، دیگر زاویوں سے ان کی شخصیت قارئین کے لیے محتاج تعارف نہیں، پروفیسر سید عزیز الدین صاحب ۲۹ دسمبر ۱۹۵۲ء علی گڑھ میں پیدا ہوئے، علی گڑھ سے ہی تاریخ میں ایم اے کیا جبکہ پی ایچ ڈی کی تکمیل جامعہ ملیہ اسلامیہ سے کی اور یہیں استاذ مقرر ہوئے۔ ان کے ریسرچ کا موضوع ”عہد اورنگ زیب عالمگیر“ تھا، تاریخ میں اردو اور انگلش میں ۹۲ مضامین کے علاوہ پندرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ۲۰۰۷ء میں ان کی نئی کتاب 1857 Revisited آئی ہے جو کافی چرچے میں ہے۔

تیسرے مرحلے میں اس نے جنوبی ہند کا رخ کیا اور مدراس کے آس پاس ایک قلعہ نمائینٹر بنایا۔ اسی طرح اڑیسہ میں بھی کمپنی نے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلائے، لیکن کمپنی کا زیادہ زور بنگال میں رہا اور رفتہ رفتہ کمپنی نے اتنا منافع کمایا کہ برطانیہ کو اس کا نہایت حوصلہ افزا مالی فائدہ پہنچا۔ تاریخی مطالعے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ مغل حکمران برطانوی تاجروں کے اصل عزائم بھانپنے میں ناکام رہے، اکبر کے بعد نور الدین جہاں گیر اورنگ زیب عالم گیر کے دور میں بھی انگریزوں کے تجارتی لبادے کے اندر چھپے ہوئے اغراض و مقاصد تک ان کی نظر نہ پہنچ سکی۔ صرف شائستہ خاں جو بنگال کا گورنر تھا اس نے اس طرف توجہ دی اور برطانوی تاجروں کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی، کئی ایک سخت اقدامات کیے مگر ان کا تسلسل باقی ندرہ سکا اور گھوم پھر کر انگریز وہی کرنے میں مصروف رہے جو ان کا اصل نشانہ تھا۔

جنوبی ہند میں سلطان ٹیپو کا باپ حیدر علی نے انگریزوں کی اصل خواہشات کو تاڑتے ہوئے شدید مزاحمت کی، لیکن نظام حیدر آباد اور مراٹھوں سے ساز باز کر کے انگریز اپنے آپ کو بچاتے رہے۔ حیدر علی کی پوری زندگی انگریزوں سے لڑتے ہوئے بنی، مگر وہ جنوبی ہند سے انگریزوں کو نکال باہر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہی حال ٹیپو سلطان کا بھی رہا، یہاں تک کہ ٹیپو نے فرانس اور ترکی تک اپنے قاصد بھیجے تاکہ ان کے تعاون سے انگریزوں کی جڑ بنیاد سے اکھیڑا جاسکے۔ مگر بد قسمتی سے ایسا کچھ نہ ہوا۔

ادھر شمالی ہند میں اپنے استحکام کے بعد انگریزوں نے سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک جال بچھا دیا۔ انہوں نے ایک طرف ہندوستان کی زراعت و تجارت و صنعت وغیرہ پر پنچے گاڑ دیے اور دوسری جانب اپنی حکمت عملی سے کرسی حکومت و اقتدار کی طرف بڑھنا شروع کیا اور اس کے لیے مال و زر اور دھونس دھمکی کی ساری تدبیریں اپناتے ہوئے راجوں، مہاراجاؤں، نوابوں، زمین داروں، تاجروں، بیویوں کے درمیان ایسے وفادار غدار پیدا کیے جو ان کے اشارہ ابرو پر رقص کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔ جب بات حد سے زیادہ بڑھی تو شمالی ہند میں بھی محاذ آرائی کی نوبت آنے لگی اور پہلی باقاعدہ جنگ پلاسی (بنگال) کے میدان میں علی وردی خاں کے نواسے نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کے

سوال (۱): بہادر شاہ ظفر اور ان کے پیش روؤں کی آخر وہ کون سی کمزوری تھی جس نے انہیں اقتدار سے بے دخلی اور غلامی تک پہنچا دیا؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد: دیکھیے! اس کے لیے ہمیں تاریخ میں جانا ہوگا، مغل سلطنت کا زوال ۱۸ویں صدی میں شروع ہوا، یہ صنعتی انقلاب کا دور تھا، اس زوال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغل سلاطین اس دور کو نہ سمجھ سکے، وہ صنعتی دور میں بھی جاگیر دارانہ نظام کو زبردستی چلانے کی کوشش کرتے رہے۔ تو سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ ہم اپنی ”سوچ“ کو Developed نہیں کر سکے اور یہ سمجھنے میں ناکام رہے کہ یہ دور کیسا ہے اور اس کے چیلنجز کیا ہیں؟ اور کن طریقوں سے ہم یورپی طاقتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ اس کو آپ اس مثال سے سمجھیے کہ اگر کوئی میز پرانی ہو جائے اور وہ پرانی ہو کر ٹوٹ جائے اور ہم اسے چولہے میں جلانے کی بجائے پھر نئے سرے سے ٹھوک ٹھاک کر کھڑی کر دیں تو میز پھر ٹوٹ جائے گی، کیوں کہ لکڑی کمزور ہوگئی ہے، اس میں کیلیں ٹھونکنے سے وہ اور کمزور ہوتی چلے جائے گی۔ یہی حال مغل دور میں جاگیر دارانہ نظام کا تھا، وہ نظام کمزور ہو گیا تھا اور مغل حکمران زبردستی اسے نافذ رکھنا چاہتے تھے جس کا نتیجہ سامنے آیا۔

مولانا یلین اختر مصباحی: دسمبر ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبتھ نے برطانوی تاجروں کو اس کی باضابطہ اجازت دی کہ وہ ہندوستان کے اندر تجارت کر سکتے ہیں، اس وقت جلال الدین محمد اکبر ہندوستان کا بادشاہ تھا، برطانوی تاجروں نے بہت محدود اور چھوٹے پیمانے پر معمولی سرمائے سے ہندوستان کے اندر اپنا کاروبار شروع کیا، اپنے کاروبار کو منظم اور مربوط کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی اور کچھ دنوں بعد سورت (گجرات) کے اندر کمپنی سے وابستہ افراد اپنی تجارتی کوٹھی بنانے میں کامیاب ہوئے اور ابتدائی مرحلے میں وہیں سے اپنی تجارت اور اس کی سرگرمیاں بڑھانے اور پھیلانے میں شب و روز مصروف ہوئے۔

دوسرے مرحلے میں کلکتہ کے قریب، گلگی میں بھی کمپنی نے اپنی ایک تجارتی کوٹھی بنائی۔

اور ثقافتی بھی لیکن میرا خیال ہے کہ معاشی سبب سب سے اہم تھا، کیوں مغل دور حکومت میں مسلمان بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے، لیکن جب سے انگریز آئے وہ انہیں اعلیٰ مناصب سے چھانٹتے گئے اور ان کو نوکریوں سے محروم کرتے گئے، مسلمانوں کے پاس اور کوئی پروفیشن نہیں تھا، اسی طرح معاشیات کے جو ذرائع تھے وہ مسلمانوں کے لیے بند ہونا شروع ہو گئے، اس سے مسلمانوں کو اپنے مستقبل کے تین خطرات لاحق ہو گئے، سرسید نے جو اسباب بغاوت کے تعلق سے دو کتابیں لکھیں، سرکشی ضلع بجنور جو ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی اور اسباب بغاوت ہند جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی، ان میں انہی باتوں کی طرف خصوصی اشارہ ہے، ان میں مذہب بھی ہے، انگریزوں نے مساجد کو توڑا اور تمام مذہبی قدروں میں دخل دینا اور انہیں آہستہ آہستہ ختم کرنا شروع کیا۔ صرف اسلام ہی نہیں ہندو دھرم کے ساتھ بھی انہوں نے یہی سلوک کیا، تو یہ تمام باتیں ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں شامل تھیں، اسی کا نتیجہ تھا کہ انقلاب میں نہ صرف بادشاہ، راجہ اور نواب بلکہ عوام بھی پورے طور پر سرگرم تھے۔ اس کو اس مثال سے سمجھیے کہ بہادر شاہ ظفر تو قلعہ چھوڑ کر ہمایوں کے مقبرے میں چلے گئے، انگریزوں نے ۱۴ ستمبر کو کشمیری گیٹ کو توڑا اور دہلی میں داخل ہوئے، لیکن کشمیری گیٹ سے لال قلعے تک پہنچنے میں انہیں پانچ دن کا وقفہ لگا۔ تو جب بادشاہ قلعہ چھوڑ کر چلے گئے تو بظاہر تو یہ ہونا تھا کہ عوام Surrender کر جاتے، لیکن نہیں، وہ پانچ دن تک انگریزوں سے لڑتے رہے۔

جہاں تک سوال کے اس حصے کی بات ہے کہ اس انقلاب میں پیش پیش کون سا طبقہ تھا؟ تو ہم اس میں کچھ تعین نہیں کر سکتے، بہادر شاہ ظفر بھی ہیں، تانٹہیہ ٹوپے بھی ہیں، بہادر شاہ کے بیٹے بھی ہیں، نواب بھی ہیں، راجہ بھی ہیں۔ بلکہ اس انقلاب کا ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر جن لوگوں کے بارے میں سمجھتے تھے کہ وہ ہمارا ساتھ دیں گے انہوں نے ساتھ نہیں دیا اور جن پر ان کو اعتماد نہیں تھا انہوں نے ساتھ دیا، جیسے نواب جھجھر عبد الرحمن خان پر بادشاہ کو اعتماد تھا، لیکن انہوں نے بہادر شاہ ظفر کا ساتھ نہیں دیا۔ دوسری طرف بلجھ گڑھ کے راجہ نہال سنگھ پر بادشاہ کو اعتماد نہیں تھا، لیکن انہوں نے سلطان کا بھرپور ساتھ دیا اور انگریزوں کا خوب مقابلہ کیا، جس کی پاداش میں انگریزوں نے چاندنی چوک پر انہیں سولی پر چڑھا دیا۔

درمیان ۱۷۵۷ء میں ہوئی، اس کے بعد نواب شجاع الدولہ سے بکسر (بہار) کے میدان میں ۱۷۶۴ء میں، پھر حافظ رحمت خاں روہیلہ سے روہیل کھنڈ (موجودہ یوپی) کے اندر ۱۷۷۴ء میں ہوئی اور آخری فیصلہ کن جنگ سرنگھ پٹنم (جنوبی ہند) میں ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو سے ہوئی جس میں ان کی شہادت کے بعد ان کی لاش کے قریب کھڑا ہو کر ایک انگریز کمانڈر نے اعلان کیا کہ آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔

۱۷۷۷ء میں اورنگ زیب عالم گیر کے انتقال کے بعد مغل حکومت کے زوال و انحطاط کا دور شروع ہو گیا تھا اور جتنے بھی مغل بادشاہ اورنگ زیب کے بعد دہلی کے تخت و تاج کے وارث ہوئے وہ عزم و ہمت، بہادری و اولوالعزمی اور تدبیر جہاں بانی جیسی صفات سے عاری تھے اور ان کے اندر اتنی صلاحیت و استطاعت نہیں تھی کہ پورے ہندوستان پر اپنا قبضہ اور سکھ برقرار رکھ سکیں۔ دوسری جانب انگریز نہایت شاطر اور عزم و حوصلہ سے بھرپور تھے۔ اس لیے نہ مغل حکمران ان کی راہ میں حائل ہو سکے نہ ہی نواب اور راجا مہاراجا ان کا کچھ بگاڑ سکے۔ بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی کمان میں انگریزی فوج نے دلی پر دھاوا بول دیا اور شاہ عالم کو ایک ایسے معاہدے پر مجبور کر دیا جس کی رو سے شاہ عالم کی برائے نام بادشاہت باقی رہے، لیکن عملاً سارے ہندوستان پر انگریز حکومت کرتے رہے۔ ٹھیک یہی حال اس سے پہلے لکھنؤ میں ہو چکا تھا کہ ۱۸۰۱ء میں نواب واجد علی شاہ کو انگریزوں نے ایک ایسے ہی معاہدے کا پابند بنادیا تھا۔

بعد کے حالات میں ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اودھ پر اور ۱۸۵۷ء میں دہلی پر اس طرح قبضہ کر لیا کہ بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت اور نواب واجد علی شاہ کی نوابی کا رہا سہا بھرم بھی ختم ہو گیا اور انگریز بلا شرکت غیرے پورے ہندوستان کے حکمران بن گئے۔

سوال (۲): - انقلاب ۱۸۵۷ء کے محرکات میں سب سے اہم کیا تھا، سیاسی، مذہبی، معاشی، قومی، اخلاقی یا اور کچھ؟ نیز اس انقلاب میں سب سے نمایاں کون سا طبقہ تھا؟ پروفیسر سید عزیز الدین احمد: - جہاں تک ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کا سوال ہے تو اس کے اسباب میں یہ سب چیزیں شامل تھیں، ان اسباب میں سیاسی بھی تھے، مذہبی بھی تھے

کا دستہ دہلی میں داخل ہوا تو وہ بھی دین دین دھرم دھرم کے نعرے لگا رہا تھا۔

دہلی وروہیل کھنڈ اور اودھ انقلاب ۱۸۵۷ء کا اصل میدان کارزار تھے اور صحیح معنوں میں علمائے کرام کے فتاویٰ اور ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی مجاہدین اور انقلابیوں کا اصل سرمایہ تھا، مشورے اور اقدامات میں علمائے کرام کی رہنمائی ہر جگہ ضروری سمجھی جاتی تھی اور علماء کی پشت پناہی نے ہی انہیں حوصلہ بخشا تھا۔ اس لیے علمائے کرام کا طبقہ ہی سب سے اہم تھا جس کی نمائندگی مفتی صدر الدین آزر دہلوی، علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا سید احمد اللہ شاہ مدرسی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مفتی کفایت علی کافی مراد آبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا وہاج الدین مرآبادی، مولانا رضا علی خاں بریلوی، مولانا امام بخش صہبائی وغیرہ کر رہے تھے۔

سوال (۳): - انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد کس نے دیا تھا اور اس کے انقلاب

۱۸۵۷ء پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد: - فتویٰ جہاد کا آغاز شاہ عبدالعزیز سے شروع ہوا، پھر بعد میں دہلی کے بہت سارے علماء نے فتویٰ جہاد دیا اور نہ صرف دہلی کے بلکہ علی گڑھ، مراد آباد اور دوسرے مقامات کے علمائے بھی اپنے اپنے طور پر فتویٰ جہاد صادر کیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی مسجد میں جمعہ کے خطبات میں انگریزوں کے خلاف تقریریں کیں اور عوام کو ان سے لڑنے کی ترغیب دلائی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف جوش و جذبہ بھڑک اٹھا اور وہ آمادہ جنگ ہو گئے اور یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے بعد میں انتقام بھی زیادہ مسلمانوں سے لیا، سب سے زیادہ مسلمانوں کو پکلا، پھانسی دی، برباد کیا، کالا پانی بھیجا، اتنی سخت کارروائی انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ نہیں کی۔ تو یہ جو کچھ ہوا سب کے سب فتویٰ جہاد کا رد عمل تھا۔

مولانا سلیمان اختر مصباحی: - دہلی کے اندر انگریزوں کے خلاف دیے جانے والے فتاویٰ جہاد کی متعین تعداد یقینی طور پر کسی مورخ نے نہیں لکھی ہے، البتہ بعض تاریخوں میں تین فتاویٰ کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان تینوں میں سے صرف ایک فتویٰ کی نقل مطبوعہ شکل میں موجود و محفوظ ہے۔ کیوں کہ ۱۸۵۷ء میں ہی دہلی کے ایک اخبار نے اس کی نقل شائع کر دی

راجہ نہال سنگھ کا ایک دلچسپ خط بھی ہے بہادر شاہ ظفر کے نام، اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ لوگ آپ کو میرے خلاف ورغلا رہے ہیں، حالاں کہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب میں بلیمہ گڑھ کا راجہ بنا تو یہاں کوئی مسجد نہیں تھی، میں نے ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی اور ایک عید گاہ تعمیر کرائی۔ تو یہ عجیب اتفاق ہے کہ بہت سے مسلم نواب بہادر شاہ کا ساتھ نہیں دے رہے تھے اور ہندو راجہ جن پر بادشاہ کو مکمل اعتماد نہیں تھا وہ پورے طور سے ساتھ دے رہے تھے۔

مولانا سلیمان اختر مصباحی: - انقلاب ۱۸۵۷ء کا کوئی ایک سبب نہیں، بلکہ اس کے متعدد اسباب و وجوہات تھے، ہندوستانی عوام اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہماری زمینی پیداوار کا اصل فائدہ انگریز اٹھا رہے ہیں۔ ہماری تجارت اور صنعت کو انہوں نے اس طرح جکڑ لیا ہے کہ اس کا اصل فائدہ برطانیہ کو پہنچ رہا ہے۔ ہمیں یا تو ان پڑھ رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے یا ایسی تعلیم ہمارے بچوں کو دینے کے طریقے اور تدبیریں اپنائی جا رہی ہیں جسے حاصل کرنے کے بعد ظاہر میں وہ تو ہندوستانی رہیں لیکن ان کا دل و دماغ انگریزوں جیسا ہو جائے۔ ہمارے سماجی ڈھانچے توڑنے کی اور ہندو مسلم منافرت پھیلانے کی انگریز لگاتار کوشش کر رہے ہیں، اپنے پادریوں اور مشنری اسکولوں کے ذریعے ہمارے مذہب پر نہ صرف حملے کیے جا رہے ہیں بلکہ ہمیں عیسائی بنانے کی اعلانیہ کوشش ہو رہی ہے۔ ہمارے معزز شہریوں کو ذلیل و خوار کیا جا رہا ہے، ہمارے علمائے توہین کی جارہی ہے اور سات سمندر پار سے آکر ہمارے اوپر حکومت کی جارہی ہے۔ یہ وہ مجموعی اسباب ہیں جو انقلاب ۱۸۵۷ء کی بنیاد ہیں، تاہم مذہب ایک ایسا عنصر ہے، جو سب پر فوقیت رکھتا ہے اور اہم ترین سبب یہی خوف ہے کہ ہمیں یا ہماری نسلوں کو جبراً عیسائی بنا دیا جائے گا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی درپردہ کوششوں کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما تھا، مولانا احمد اللہ شاہ مدرسی جنہوں نے ۱۸۳۶ء سے دلی، آگرہ، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ تک اپنی خفیہ مہم کا جال پھیلا رکھا تھا اور میرٹھ کے انقلابیوں میں بھی ان کے آدمی اپنا کام کر رہے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں بارک پور (کلکتہ) اور ممبئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ کے انقلابیوں نے گائے اور خنزیر کی ملی ہوئی چربی والے کارتوس کو دانت سے کاٹنے سے انکار مذہبی بنیاد پر ہی کیا تھا۔ اور ۱۸۵۷ء میں کو میرٹھ سے چل کر جب ۱۱ مئی کی صبح کو ۸۵/۸ انقلابیوں

میں انقلاب تو کیا کوئی قابل ذکر جنبش بھی نہیں ہوئی اور نظام حیدر آباد تو انگریز نواز تھے ہی، ادھر دلی سے متصل صوبہ پنجاب جو ہمیشہ ہندوستان کا بازوئے شمشیر زن مانا جاتا رہا تھا، یہ بازو نہ جانے کیوں مجموعی طور پر مفلوج رہا، ادھر روہیل کھنڈ میں نواب رام پور نظام حیدر آباد کی طرح انگریزوں کے وفادار ثابت ہوئے اور مراد آباد وغیرہ میں انقلابیوں کی تیخ کئی کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی، ہندوؤں کے درمیان اگرچہ منگل پانڈے، رام کنور سنگھ، رانی لکشمی بائی، نانا پیشوا، تانگیر ٹوپے، راجا ناہر سنگھ جیسے جواں مرد اور جیلے نظر آتے ہیں، مگر مجموعی طور پر ہندوؤں کے اندر وہ جوش و خروش نہیں تھا جو مسلمانوں کے اندر جگہ جگہ پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں ہی کو زیادہ نشانہ بنایا اور لاکھوں مسلم عوام کے ساتھ ہزاروں علما کو پھانسی دی یا کالا پانی بھیجا، یا انہیں تباہ و برباد کیا اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے اندر جوش و خروش اور جذبہ جہاد علما کے فتاویٰ کی بنیاد پر ہی تھا اور ان کا جذبہ یہ بھی تھا کہ انگریزوں نے مکرو فریب اور ظلم و جارحیت کے ذریعے یہ ملک ہم سے چھینا ہے، اس لیے ہمیں بڑھ کر ان انگریزوں سے بزور قوت و طاقت دوبارہ اپنی اس میراث کا وارث بننا ہے اور اس ملک پر ہمیں اپنی حکومت قائم کرنی ہے۔

سوال (۵): - انقلاب ۱۸۵۷ء کے موقع پر ہندو مسلم اتحاد کی کیا صورت تھی؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد: - اس وقت ہندو مسلم اتحاد تھا، لیکن انگریزوں نے اسے توڑنے کی کوشش کی۔ جیسے ایک دستاویز مجھے ملا کہ انگریزوں نے اس زمانے میں پچاس ہزار روپے بریلی کے کلکٹر کو بھیجے تاکہ اسے ہندوؤں میں تقسیم کیا جائے اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا جائے، لیکن انگریز اپنے اس منصوبے میں ناکام ہو گئے۔ بریلی کے کلکٹر نے باضابطہ یہ خط لکھا کہ ہم یہ پیسے واپس کر رہے ہیں کیوں کہ ہم اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ تو اس طرح کے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ انگریزوں نے ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے کی کوشش کی، بعض میں انہیں کامیابی بھی ملی، لیکن فی الجملہ اس وقت ہندو مسلم اتحاد کی صورت بہتر تھی۔

مولانا سلیم اختر مصباحی: - انگریز مجموعی طور پر ہندو اور مسلمان دونوں کا مشترکہ دشمن تھا، کیوں کہ ہندو اور مسلمان ہی اس ملک کی غالب اکثریت تھی، اس لیے کئی جگہوں پر ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ کی، لیکن یہ سب کے سب بہادر

تھی۔ منشی ذکاء اللہ دہلوی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ علامہ فضل حق خیر آبادی نے ۱۸۵۷ء میں جامع مسجد دہلی کے اندر انگریزوں کے خلاف جہاد پر ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور اسی روز متعدد علماء کے دستخط کے ساتھ خود علامہ ہی کی تحریک پر ایک فتویٰ جہاد جاری ہوا۔ اسی طرح بریلی میں مفتی عنایت احمد کا کوروی، مراد آباد میں مولانا کفایت علی کافی، بدایوں میں مولانا فیض احمد بدایونی وغیرہ نے فتاویٰ جاری کیے اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا ماحول تیار کیا۔

سوال (۴): - مسلمانوں کا کون سا طبقہ انگریزوں کی تائید و حمایت میں تھا؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد: - اس میں بھی ہم کوئی تعین نہیں کر سکتے، مسلمانوں کے ہر طبقے میں مخالف بھی نظر آتے ہیں اور موافق بھی۔ علماء میں بھی بہت سے انگریزوں کے ساتھ تھے، زمین داروں میں بھی بہت ساتھ تھے، شعراء میں بھی بہت سے ساتھ تھے، غدار شعراء بھی ہیں جنہوں نے انگریزوں کی حمایت کی اور وہ شعراء بھی ہیں جن کے کلام کی وجہ سے انگریزوں نے انہیں شہید کر دیا، تو آپ تعین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ اس طبقے نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور اس نے ان کی مخالفت کی، دہلی کے مولوی باقر جو دہلی کے اردو اخبار کے ایڈیٹر تھے انہوں نے انگریزوں کے خلاف اپنے ادارے لکھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے، سادات میں بھی کچھ ایسے تھے جو انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے اور کچھ سادات ایسے تھے جو ان کے خلاف تھے۔ شعراء میں غالب کے کلام میں بھی انگریزوں سے نفرت ہے، لیکن غالب کی دو تصویریں ہمارے سامنے ہے، ایک تصویر انگریزوں کی موافقت میں ہے جب کہ دوسری مخالفت میں ہے۔ غالب کے مقابلے دوسرے شعراء کو دیکھیں تو انہوں نے انگریزوں کے خلاف زیادہ واضح باتیں کیں مثلاً مولوی محمد حسین آزاد کو لیجیے جو مولوی باقر کے بیٹے تھے۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف نظمیں لکھیں جو دہلی اردو اخبار میں چھپیں۔ ان کے علاوہ مراد آباد اور امر وہ کے شعراء جن کا قد نسبتاً چھوٹا ہے، جس کی وجہ سے کوئی ان کا نام نہیں لیتا، انہوں نے انگریزوں کے خلاف خوب لکھا اور ان میں سے بہتوں کو دارورسن کے پھندے چومنے پڑے۔

مولانا سلیم اختر مصباحی: - انقلاب ۱۸۵۷ء کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو جنوبی ہند

کرنا چاہیے کہ ہم نے کیا کام کیا؟ ہندوستان اور پاکستان میں صرف ۱۸۵۷ء کے ۷۰ ہزار Documents موجود ہیں اور یہ سب کے سب اردو اور فارسی میں ہیں۔ اب یہ بتائیے ان دستاویزات کی تحقیق اور چھان بین کون کرے گا؟ پروفیسر گیان شرما یا پروفیسر نرادی بھٹا چاریہ ان دستاویزات پر کیسے کام کریں گے؟ یہ کس کی ذمہ داری ہے؟ یہ ذمہ داری ہے شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی کی، شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی کی، شعبہ عربی جامعہ ملیہ شعبہ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی، شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی، شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اور شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی اور عربی مدارس کے ان اساتذہ کی جو اردو اور فارسی جانتے ہیں، سوال ہے کہ ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے باوجود آخر کیوں ان لوگوں نے ان دستاویزات پر کام نہیں کیا؟ کب تک ہم دوسروں کو یہ الزام لگاتے رہیں گے کہ ہمارا نام نہیں آتا۔ آپ کا نام جب آئے گا جب آپ کام کریں گے۔ آپ جب میرا انٹرویو لینے آئے ہیں جب ہی تو میں آپ کو انٹرویو دے رہا ہوں۔ اگر آپ میرے پاس آتے ہی نہیں تو میں کیسے آپ کو انٹرویو دیتا۔ تو سب سے پہلے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ آزاد ہندوستان میں مسلم ثقافت کے تحفظ کی ذمہ داری دوا داروں پر ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ تو آپ پہلے ان پر سوال اٹھائیے بہ نسبت دوسرے دانشوروں کے جو دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ہیں۔ ہم تو خود کچھ کام کرتے نہیں اور بیٹھے بیٹھے دوسروں پر الزام دھرتے اور شکوے کرتے ہیں۔ ہم سرسید پر بھی الزام دھرتے رہتے ہیں، لیکن آخر ہمارے اندر سرسید جیسا کام کرنے کا جذبہ کیوں نہیں پیدا ہوتا؟ تو صرف دوسروں کو الزام دینے سے کام نہیں چل سکتا، ہمیں خود کام کرنا ہوگا۔ مراد آباد میں جو لوگ مارے گئے، جو شہید کیے گئے جو لوٹے گئے، کیا مراد آباد والوں کو آج ان کے نام معلوم ہیں؟ علی گڑھ کے مسلمانوں کو اپنے شہیدوں کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟ آپ ہمیں بتائیے کہ جتنے بڑے شہر ہیں، دہلی، علی گڑھ، مراد آباد وغیرہ ان شہروں کی مسلم تنظیموں نے ۱۸۵۷ء پر کوئی پروگرام کیا؟ تو کون ہائی لائٹ کرے گا؟ آپ کو دینک جاگرن، ہندوستان اور دوسرے ہندی یا انگریزی اخبارات جب ہی تو شائع کریں گے جب آپ مدرسے میں اپنے ادارے میں ۱۸۵۷ء پر پروگرام کریں گے، بتائیے

شاہ ظفر کو، اپنا بادشاہ سمجھتے تھے، یہ سب اسی لیے کہ رانی لکشمی بائی، نانا پیشوا، تانتیہ ٹوپے وغیرہ نے سبز پرچم لہرایا تھا، بہادر شاہ ظفر کو دلی کے تخت و تاج کا اصل مالک سمجھتے تھے۔

سوال (۶): - آزادی ۱۹۴۷ء پر انقلاب ۱۸۵۷ء کے کیا اثرات رہے؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد: - آزادی کی لڑائی کا آغاز تو ۱۸۵۷ء سے ہی ہوا، اسی لیے اسے پہلی جنگ آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں، انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں کامیابی کے بعد تین یونیورسٹیز قائم کیں، مدراس، بمبئی اور کلکتہ اور یہ اتفاق ہے کہ جو ہندوستانی ان یونیورسٹیز میں پڑھے، فراغت کے بعد انہی لوگوں نے آزادی کی باضابطہ جدوجہد کا آغاز کیا اور نتیجہ کے طور پر ۱۹۴۷ء میں اپنا ملک انگریزوں کے تسلط سے آزاد ہو گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی ۱۸۵۷ء کی دین ہے، ظاہر ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے بعد ہی سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم دلایا جائے اور انہیں سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھایا جائے تاکہ جدید صنعتی انقلاب کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی ہے مسلمان اس کا مقابلہ کر سکیں۔ مدرسے تفسیر و حدیث کی تعلیم تو دے رہے تھے، لیکن جو صنعتی انقلاب ظہور پذیر ہوا تھا مسلمان اس کا مقابلہ کیسے کرتے، اس کے لیے جدید تعلیم کا حصول ضروری تھا۔ اس طرح ہم علی گڑھ تحریک کو بھی ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا ہی نتیجہ سمجھتے تھے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے کہ ۱۹۴۷ء کی آزادی انقلاب ۱۸۵۷ء کا ہی نتیجہ ہے۔

مولانا یونس اختر مصباحی: - کئی مورخین نے صاف صاف یہ تحریر کیا ہے کہ ۱۹۴۷ء دراصل ۱۸۵۷ء کا تکملہ ہے، ۱۹۴۷ء سے پہلے کے زعماء و قائدین کو تحریک دراصل ۱۸۵۷ء ہی سے ملی اور ہمارا ہندوستان مدتوں بعد آزادی سے ہمکنار ہوا اور یہ واضح ہے کہ حال کی تاریخ کا ماضی سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے اور بہت سی چیزوں کے اثرات و نتائج کسی نہ کسی شکل میں بعد میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کا بھی ہے۔

سوال (۷): - ملکی سطح پر انقلاب ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں مسلمانوں خصوصاً علماء کو

نظر انداز کرنے کے کیا اسباب ہیں؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد: - دیکھیے! دوسروں پر الزام دینے سے پہلے ہمیں اپنا محاسبہ

یورپ کی ٹکنالوجی کی دنیا میں غلام ہیں، انہی کی ایجاد کردہ چیزیں ہم استعمال کرتے ہیں، وہ بھی اس طرح کہ جو چیزیں وہ ۲۰ سال پہلے استعمال کر چکے ہوتے ہیں انہیں ہم آج استعمال کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ آج بھی ہم غیر ملکی طاقتوں کی غلامی قبول کیے ہوئے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔ ہماری غفلت کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ یورپ میں زمانے سے جمہوریت قائم ہے اور اسی جمہوریت کی وجہ سے اہل یورپ بہت آگے بڑھ چکے ہیں، جب کہ ہمارے یہاں آج بھی بہت سے مسلم ممالک میں موروثی بادشاہت قائم ہے، آپ خود سوچے کہ موروثی بادشاہت سے کیا ہم خاک ترقی کریں گے؟ تو مسلم دنیا کو خاص طور پر ۱۸۵۷ء سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنے یہاں جمہوریت نہیں قائم کی اور موروثی بادشاہت سے چمٹے رہے تو ان کا حشر بھی مغل حکومت سے مختلف نہیں ہوگا۔ آپ ایران کی مثال لیں جہاں ۱۹۷۹ء میں جمہوریت قائم ہوئی اور آج وہ کسی لائق ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ یورپی ممالک کے نشانے پر بھی ہے۔ حاصل یہ کہ تمام مسلم ممالک میں جمہوریت لانے کی کوشش ہونی چاہیے، ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس سلسلے میں کسی عالم کی کوئی تحریر نہیں پڑھتے، پتہ نہیں کس مصلحت نے ان کی زبانیں بند کر رکھی ہیں، جب کہ جمہوریت کا پہلا داعی اسلام ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۲۲ء میں سب سے پہلے اسلامی جمہوریت قائم کی تھی۔ بعد میں ہم نے ملوکیت کو قبول کر لیا، یہی ہمارے زوال کا سبب بنی، ہے اور رہے گی۔

مولانا یسین اختر مصباحی:- اس تاریخی انقلاب سے یہ سبق ملتا ہے کہ قوم کو غلام نہیں بلکہ آزاد رہنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے آپ کو مضبوط اور منظم رکھنا چاہیے، اسی طرح اپنی صفوں میں پائے جانے والے غداروں سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے اور کسی بھی خارجی قوت کے مقابلے میں ہندو مسلمان دونوں کو سیاسی سطح پر متحدہ اقدام کرنا چاہیے۔ آج کے حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ صرف برطانیہ نہیں بلکہ پورے یورپ اور ان سب کے آقا امریکہ نے سیاسی اور تجارتی راستوں سے ہندوستان کے اندر گھس پیٹھ اور اسے کنٹرول کرنے کی جوئی ہم چھیڑ رکھی ہے اور بظاہر ایک بہت چھوٹے مگر اندر سے نہایت خطرناک اور مضبوط عنصر جسے یہودی لابی کہا جاتا ہے، ان سب سے ہمیں قدم قدم پر ہوشیار رہنا چاہیے۔ □□□

مراد آباد، بریلی، سہارنپور، امر وہہ، علی گڑھ کے کسی مدرسے نے اس پر کوئی پروگرام کیا اور نہیں کیا تو کیوں نہیں کیا؟ ۱۰ مئی سے اس کی ۱۵۰ سالہ سالگرہ شروع ہو گئی اور آج ۲۶ جون ہو گیا کسی ادارے نے کوئی پروگرام نہیں کیا، میں نے کوئی خبر نہیں پڑھی۔ تو صرف دہلی یونیورسٹی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کیوں ذمہ دار ہیں؟ پہلے تو ہمارے ادارے ذمہ دار ہیں، ہم ذمہ دار ہیں، ہمارے علماء ذمہ دار ہیں، دانشور ذمہ دار ہیں، ان لوگوں نے اس پر کیا کام کیا؟ جو بڑے بڑے عہدے اور مناصب لیے ہوئے ہیں وہ اس طرف کیوں نہیں توجہ کرتے؟ جامع مسجد کو دو سال تک انگریزوں نے اصطبل بنائے رکھا، تو کیا دہلی کی جامع مسجد میں کوئی پروگرام ہوا اس حوالے سے کہ ہمیں اپنی تاریخ معلوم ہوتی؟ صرف دوسروں کو ملزم ٹھہرانے سے کام نہیں چلے گا۔ پہلے ہمیں کام کرنا ہوگا، پہلے ہمیں کتابیں لکھنی ہوں گی، جب ہماری تحریریں دوسرے پڑھیں گے تب ان کی تحریروں میں وہ باتیں آئیں گی۔

مولانا یسین اختر مصباحی:- انقلاب ۱۸۵۷ء کا ذکر اور چرچا اس کی حیثیت اور عظمت کے مطابق نہ کیا جانا ایک نہایت افسوس ناک رویہ ہے اور اس رویے کو جلد از جلد تبدیل کیا جانا چاہیے۔ ہندو تو اس کے ذکر سے عموماً اس لیے کتراتے ہیں کہ انقلاب کی کمان اور باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن بعض مسلمان دانش ور اور مورخین بھی اسے اس لیے نظر انداز کرتے ہیں کہ ان مسلمانوں کی کمان علماء کے ہاتھوں میں تھی اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ طبقہ علماء کو یہ حضرات کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حتی الامکان ان افراد کی تاریخ اور اس کے قائدین کے حالات توڑ مروڑ کر پیش کیے جاتے ہیں اور اصل حیثیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سوال (۸):- انقلاب ۱۸۵۷ء کی ۱۵۰ ویں برسی پر ہندوستانیوں کو اس سے کون سا سبق ملتا ہے؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد:- ۱۸۵۷ء سے ہندوستانیوں کو بہت بڑا سبق ملتا ہے، وہ یہ کہ آج کے حالات ۱۸۵۷ء سے بہت مختلف نہیں ہیں، اگر آج ہم میں وہی غفلت رہی جو ۱۸۵۷ء کے موقع پر تھی تو غیر ملکی طاقتیں پھر سے ہمیں اپنا غلام بنالیں گی، ویسے بھی ہم آج

